ریت کی دیوار



رزاق شاہد کوہلر

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ریت کی دیوار



رزاق شاہد کوہلر





ریت کی دیوار



کتابی شکل: پاکستانی پوائنٹ کمپوزنگ ٹیم









(محبت ایک لافانی جذبہ ہے،جب تک دنیاباقی ہے یہ جذبہ بھی پائندہ وتابندہ رہے گا۔ مگر کہتے ہیں کہ محبت کی راہیں بہت کٹھن اور دشوار گزار ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ ان راہوں پر چلنے والوں کے حوصلے نا قابلِ تسخیر ہوتے ہیں،وہ جان دے دیتے ہیں مگر ہار اُنھیں گوارا نہیں ہوتی۔ راستے کی ہر رکاوٹ کو وہ اپنے پاؤں کی ٹھوکر پر رکھتے ہیں۔ جان پر کھیل کر ہر رکاوٹ کو عبور کرنا اہلِ محبت کا شیوہ رہا ہے۔ یہ رکاوٹیں چاہے بپھرے ہوئے دریاؤں کے روپ میں ہوں یا سنگلاخ پہاڑوں کے، عشق کرنے والے کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتے وہ منزل پر پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں لیکن وہ جن کے حوصلے پست ہوتے ہیں وہ کبھی محبت کی معراج تک نہیں پہنچ پاتے۔ اُن کے ہاتھ صرف راستوں کی دھول ہی آتی ہے)

[ایک ایسے کم حوصلہ وپست ہمت شخص کا الم ناک قصہ، جو کارزارِ محبت میں پاؤں رکھنے کی جسارت کر بیٹھا]

"انسان احساسات و جذبات کا مجموعہ ہے اوراس کے پاس طاقت ورترین احساس بھوک کا ہے۔ جسے پیٹ کی آگ بھی کہتے ہیں۔" کلاس روم میں پروفیسر ارشد زمان کی آواز گونج رہی تھی۔ پوری کلاس ہمہ تن گوش تھی۔ طلباء وطالبات کی نگاہیں پروفیسر کے چہرے پر مرتکز تھیں۔ پروفیسر ارشدزمان پوری یونی ورسٹی میں اپنے پُر مغز، مدلل اور دل چسپ لیکچرز کی وجہ سے مشہور تھا۔ وہ کسی بھی موضوع پر بلا تکان بولتا تھا اور اُس کے بولنے کا انداز مسحور کن تھا۔ اسٹوڈنٹس پوری دلچبی اور شوق کے ساتھ اُس کے لیکچر سنا کرتے تھے۔

بلاشک وشبہ وہ پوری یونی ورسٹی میں اسٹوڈنٹس کا پسندیدہ پروفیسر تھا۔ چنانچہ اس پاپولریٹی نے اُسے کسی حد تک مغرور بنادیا تھا۔

پروفیسر لیکچر جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "دنیا میں ایسے لاتعداد واقعات رونما ہوچکے ہیں جب کسی انسان نے اپنی بقا کے لیے اپنے ہی جیسے انسان کا گوشت کھانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ بھوک کے سامنے تمام انسانی جذبات کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ ایک بھوکے انسان کے سوچنے سمجھنے کی سب صلاحیتیں سلب ہوجاتی ہیں۔ بھوک ہر انسانی جذبے پر غالب آجاتی ہے۔ معروف شاعر ساحر لدھیانوی کہہ گیا ہے کہ بھوک آداب کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتی۔ اپنی بھوک مٹانے کے لیے انسان نے"

"بھوک سے بھی طاقت ور ترین انسانی جذبہ عشق کہلاتا ہے۔" معاً درمیانی نشستوں سے ایک لڑکے کی آواز آئی اور پروفیسر کی بات ادھوری رہ گئی۔

"اوہ عدنان حیدر صاحب یہی نام ہے ناں تمہارا؟" پروفیسر کا انداز سو�� لیہ مگر لہجے میں طنز تھا۔

"یس سر۔" عدنان نے اثبات میں سر ہلایا۔ " آپ کو اچھا لگتا ہے تو آپ رکھ لیں، میں کوئی اور اچھا سا نام ڈھونڈ لوں گا۔"

کلاس روم میں ہنسی کی آواز گونجنے لگی، جسے پروفیسر نے نظر انداز کر دیا۔ وہ چند لمحے عدنان حیدر کو گھورتا رہا پھر طنزاً بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ تمہارا باپ ایک ارب پتی ہے اگر یہ بات سچ ہے تو پھر تمہیں بھوک کا تجربہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تاہم عشق و محبت کے تجربے کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل ہے شاید یہ تجربہ تمہیں ہو چکا ہو یا پھر ابھی ابتدائی مراحل میں ہو، بہر کیف میں اتنا جانتا ہوں کہ خالی پیٹ انسان محبت تو کیا خود کو بھی بھول جاتا ہے محبت کی اوقات ہی کیا ہے بھوک کے سامنے۔"

"اوقات ہے سر۔" وہ لفظ اوقات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "ہاں آپ کی نگاہوں میں نہ ہو تو یہ اور بات ہے۔"

"لگتا ہے برخوردار کو نئی نئی محبت ہوئی ہے۔" پروفیسر نے برجستہ کہا اور تمام کلاس بے ساختہ ہنسنے لگی۔

"نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ جذبہ تو قسمت والوں کو عطا کیا جاتا ہے۔ وہ جن کے پاس ظرف ہوتا ہے، کم ظرف کبھی محبت کی قدر نہیں کرتے۔"اُس نے جھٹ سے جواب دیا۔

پروفیسر کے چہرے پر سے ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ عدنان کا جواب اُس کے لیے کسی طمانچے سے کم نہیں تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اُس کے چہرے پر ذلت کا احساس اُبھرا مگر

دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گیا۔ گرمیوں کا موسم ہونے کی وجہ سے اُس نے ہاف آستین کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اُس کی دونوں کہنیوں کی ہڈیاں جوڑ سے قدرے اُبھری ہوئی تھیں۔ غور سے دیکھنے پر صاف معلوم ہوتا تھا جیسے کہنیوں کی ہڈیاں ٹوٹنے کے بعد دوبارہ جوڑی گئی ہوں اور یہ کام کسی اناڑی سرجن نے انجام دیا ہو۔ پروفیسر نے سر جھکا کر کہنیوں کی طرف دیکھا اور پھر سر اُٹھا کر بولا۔ "ہم بات طاقت ورترین انسانی جذبے کی کر رہے تھے۔ نہ کہ ظرف اور کم ظرفی کی اب بات صرف موضوع پر ہو گی۔"

"میں کہاں موضوع سے ہٹا ہوں سر؟ آپ نے خود ہی موضوع کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔" عدنان نے احتجاج کیا۔

پروفیسر نے سر ہلایا۔" اوکے میں تم سے متفق ہوں چلو اب ثابت کرو کہ محبت بھوک سے کس طرح طاقت ور ہے؟"

وہ بولا۔" سر! اسے ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو ثابت شدہ حقیقت ہے۔ کیا آپ نیوز پیپر نہیں پڑھتے، ٹی وی نہیں دیکھتے؟ روزانہ کتنے ہی لوگ محبت میں ناکام ہونے کے بعد خود کشی کر لیتے ہیں جب کہ کوئی بھوکا کبھی کبھار ہی ایسا قدم اُٹھاتا ہے۔"

"کیا تم محبت میں ناکام ہونے کے بعد خود کشی کرنے کی ہمت کر سکتے ہو؟" پروفیسر نے مذاق کے انداز میں پوچھا۔

"ہوسکتا ہے لیکن فی الحال میں کسی سے محبت نہیں کرتا۔

"اوہ" پروفیسر نے مسکرا کر سر ہلایا۔ "چلو یہ بتا دو کہ محبت ہوتی کیا ہے؟"

"مجھے لگتا ہے سر! کہ مجھ سے بہتر آپ یہ بات جانتے ہوں گے۔" اُس نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا اور کلاس روم میں ایک بار پھر ہنسی کی آواز گونج اُٹھی۔

ایک ثانیے کے لیے عدنان نے اپنے کلاس فیلوز کی طرف دیکھا تو کچھ اُسے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جب کہ بعض کی نظروں میں اُس کے لیے ناپسندیدگی تھی۔ اُس سے چند نشستیں دور بیٹھی ایک لڑکی اُسے قدرے غصیلے انداز میں گھور رہی تھی۔ اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں لڑکی سے استفسار کیا تو لڑکی نے اُسے چپ رہنے کا اشارہ کر دیا۔ مگر اس دوران پروفیسر اُسے مخاطب کر چکا تھا۔

"کیوں بھئی! میں بھلا تم سے بہتر کس طرح جان سکتا ہوں کیا میں نے عشق کی دکان کھول رکھی ہے؟"

"سر! میری چھٹی حس کہتی ہے کہ آپ نے نوجوانی میں ضرور کسی نہ کسی سے محبت کی ہو گی ورنہ آپ محبت سے نفرت کیوں کرتے؟"

پروفیسر کی رنگت ایک مرتبہ پھر سے پھیکی پڑ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اُس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو، خیالات کی ایک یلغار تھی جو اُسے گھیر چکی تھی اور ماضی کی ایک فلم سی اُس



کے دماغ میں چل پڑی تھی۔وہ اب اُس وقت کو کوس رہا تھا جب اُس نے عدنان حیدر جیسے منہ پھٹ لڑکے سے بحث چھیڑی تھی۔عدنان انجانے میں اُسے چڑکے پر چڑکا لگائے جا رہا تھا لیکن وہ بے بس تھا۔عدنان کو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔پروفیسر کو عشق و محبت سے خدا واسطے کا بیر تھا۔اُس کی نگاہوں میں محبت ایک بے کار ترین مشغلہ تھا جو فارغ لوگوں کی ہی راس آتا تھا۔

"عدنان حیدر!" وہ دوبارہ موضوع پر آتے ہوئے بولا۔"تمہیں معلوم ہے کہ بھوکا انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے۔محبت کی تو کوئی حیثیت نہیں ہے بھوک کے سامنے۔"

"نہیں سر!" اُس نے نفی میں سر ہلایا۔" اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ خدا کو ہمیشہ پیٹ بھرے ہی بھولتے ہیں،بھوکے تو پل پل اُسے یاد کرتے ہیں۔"

وقتی طور پر اُس نے پروفیسر کو لاجواب کر دیا تھا۔اُس کے کلاس فیلوز اب اُسے ستائشی انداز میں دیکھ رہے تھے۔مگر محبت اور بھوک کی اس بحث میں پروفیسر کو محبت کی جیت کسی صورت میں بھی منظور نہیں تھی۔وہ بولا۔" بھوک نے دنیا میں کئی بار انقلاب برپا کیے ہیں لیکن محبت نے آج تک کچھ بھی نہیں کیا سوائے رونے دھونے اور خودکشیاں کرنے کے۔تم ایسی ایک بھی مثال پیش نہیں کر سکتے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ محبت بھوک کے مقابلے میں طاقت ور ہوتی ہے۔"

"میں ثابت کر سکتا ہوں۔" وہ پُر جوش ہو گیا۔" آج سے چودہ صدیاں قبل ایک انقلاب برپا ہوا تھا۔ جس نے اُس وقت کی دنیا کا نقشہ بدل ڈالا تھا اور ہم سب جانتے ہیں کہ وہ انقلاب بھوک کا مرہونِ منت نہیں تھا۔ اگر غیر جانب داری سے دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس عظیم انقلاب کو برپا کرنے میں محبت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ رسول ﷺ کی خدا سے محبت اور آپ ﷺ کے پیروکاروں کی آپ ﷺ سے محبت ہی اُس عظیم انقلاب کی سب سے بڑی وجہ تھی لیکن شاید آپ بھی اُن لبرل مائنڈڈ لوگوں کی طرح یہ بات تسلیم نہیں کریں گے جو اس عظیم انقلاب کا سبب عربوں کی بھوک اور ہوسِ ملک گیری بتاتے ہیں۔"

"یہ لبرل لوگ کچھ غلط تو نہیں کہتے میاں! اب تمہاری طرح ہر کوئی حقیقت سے انکار تو نہیں کر سکتا۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

"سر! میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ بھوک جان لیتی ہے جب کہ محبت جان دیتی ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ جان لینا آسان ہوتا ہے مگر جان دینا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ جان وہی لوگ دیتے ہیں جن کے دل میں عشق کی شمع روشن ہوتی ہے اور جان لینے والے کبھی بھوک تو کبھی نفرتوں کے مارے لوگ ہوتے ہیں۔ محبت تاج محل تعمیر کرتی ہے تو نفرت بابری مسجد شہید کرتی ہے۔ محبت عظیم ہوتی ہے سر عظیم کبھی نہ مٹنے والی جب کہ بھوک پیٹ بھرتے ہی مٹ جاتی ہے۔ سیر ہونے کے بعد بھوک کا احساس تک باقی نہیں

رہتا۔ بھوک کی عشق کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔" اُس نے جذباتی لہجے میں جواب دیا تو پوری کلاس نے باقاعدہ تالیاں بجا کر اُسے داد دی۔

پروفیسر ارشد زمان ایک بار پھر لاجواب ہو کر رہ گیا۔ مگر وہ شکست ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بیس برس قبل ہی وہ محبت پر لعنت بھیج چکا تھا۔ چنانچہ تالیوں کا شور تھمتے ہی پروفیسر نے کہا۔" محبت بھی تو بھوک ہی کی ایک قسم ہے۔ بدن کے حصول کے بعد اکثر محبتیں ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔"

"محبت اگر بدن کے حصول تک محدود ہوتی تو تاج محل کبھی تعمیر نہ ہوا ہوتا سر اور ایک ماں اپنے بچے سے محبت بدن کے حصول کے لیے تو نہیں کرتی مان لیں سر! کہ محبت سے بڑا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ بھوک آپے سے باہر ہو کر خونی انقلاب لاتی ہے جب کہ محبت دلوں کو تسخیر کرتی ہے اور دائمی انقلاب کا باعث بنتی ہے۔ کائنات کی ساری رنگینیاں محبت ہی کے دم سے ہیں، بقول شاعر رونقِ بزم جہاں ہے تو اسی کے دم سے اور کچھ بھی نہیں دنیا میں محبت کے سوا۔"

پروفیسر بولا۔" تم کچھ بھی کہو مگر میں تم سے متفق نہیں ہوں میں اب بھی یہی کہوں گا کہ بھوک طاقت ور ترین احساس ہے۔ محبت میں ہارا ہوا انسان زندہ رہ سکتا ہے لیکن بھوک کا مارا ہوا نا ممکن کبھی بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔"

اسی دوران پیریڈ اختتام پذیر ہو گیا اور یہ بحث ادھوری رہ گئی۔ پروفیسر نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے عدنان کی طرف دیکھا اور پھر کلاس روم سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

عاتکہ نے گھور کر اُسے دیکھا اور پھر شکایتی انداز میں بولی۔" آج تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا لیکن تم نے پھر بھی پاپا کی انسلٹ کر دی۔ کیوں کرتے ہو تم ایسا، آخر پاپا سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟"

"میں نے کچھ غلط نہیں کیا عاتکہ یہ تو صرف ایک بحث تھی جو بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو گئی۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ میں تمہارے پاپا کی بہت عزت کرتا ہوں۔" اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں جانتی ہوں عدیلیکن تمہیں شاید نہیں معلوم کہ پاپا کو محبت کے نام سے سخت چڑ ہے۔ بلکہ اُنھیں تو محبت کا نام سننا بھی گوارا نہیں ہے۔"

اُس وقت وہ دونوں ایک معروف ریسٹورنٹ میں بیٹھے کولڈ ڈرنکس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اُن کی دوستی کو تقریباً ایک سال کا عرصہ ہونے والا تھا مگر بات ابھی تک صرف دوستی تک ہی محدود تھی۔ پسندیدگی کے مراحل تک نہیں پہنچی تھی۔ یا اگر پہنچ بھی چکی تھی تو اس کا اظہار ابھی تک کسی جانب سے بھی نہیں ہوا تھا۔ البتہ اُن کی دوستی واقعی بے مثال



تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا دل سے احترام کرتے تھے۔ جس کا اظہار وہ ایک دوسرے سے گاہے گاہے کرتے رہتے تھے۔ عاتکہ زمان پروفیسر ارشدزمان کی اکلوتی بیٹی تھی جب کہ عدنان حیدر کا تعلق گجرات کی ایک جاگیردار فیملی سے تھا۔ اُس کا باپ فرمان حیدر چودھری ایک وسیع وعریض جاگیر کا مالک تھااور روایتی جاگیرداروں کی طرح ملکی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتارہتا تھا۔ گو کہ اُس نے خود کبھی بھی عملی طور پر سیاست میں حصہ نہیں لیاتھا۔ تاہم اپنے چھوٹے بھائی قربان حیدر چودھری کو وہ کئی بار صوبائی اسمبلی کی نشست پر بطور اُمیدوار کھڑا کرچکاتھا۔ مگر جیت ایک بار بھی قربان حیدر کے حصے میں نہیں آئی تھی

عاتکہ کی بات سن کر عدنان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔" یہ پروفیسر بھی ناں! بس عجیب چیز ہیں۔ کبھی انہیں چودھریوں سے کے نام سے چڑ ہو جاتی ہے تو کبھی محبت کے نام سے۔ پتانہیں ان کی پرابلم کیاہے؟"

"تم نے پاپاکو چیز کہا۔" عاتکہ نے آنکھیں نکالیں۔" وہ تمہیں چیز نظر آتے ہیں کچھ شرم وحیاہے کہ نہیں؟"

"شکر کرو صرف چیز کہاہے۔ عجیب نہیں کہا۔" اُس نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

"جس دن پاپا کو پتا چل گیا ناں کہ تم بھی چودھری ہی ہو تو اُس دن تمہیں معلوم ہو گا کہ وہ کیا چیز ہیں؟"

"نہیں بھئی! یہ بات اُنہیں پتا نہیں چلنا چاہیے۔ میں آئندہ اُنہیں چیز نہیں کہوں گا۔ آئی ایم رئیلی سوری۔" اُس نے با قاعدہ کانوں کو چھوتے ہوئے پرامس کیا تو عاتکہ کھل اُٹھی۔

"عدی!" وہ کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ " یہ یونی ورسٹی میں ہم دونوں کا فائنل ایئر ہے ناں؟"

"یس۔" اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔"کوئی پریشانی ہے کیا؟"

"مطلب ہم دونوں چند ماہ کے بعد ہمیشہ کے لیے جُدا ہو جائیں گے؟" اُس نے افسردہ ہو کر پوچھا۔

"عاتکہ! ہم یہاں انجوائے کرنے کے لیے آئے ہیں۔ کامیاب انسان وہی ہوتا ہے جو ہر قسم کے حالات میں خوش رہنا سیکھ لیتا ہے۔ جو آج سے لطف اندوز ہونا جانتا ہے اُسے آنے والے کل کی فکر کبھی پریشان نہیں کرتی یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے عدی۔" وہ مصر ہوئی۔" تم بات کو ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"تو کیا کہوں تم بتاؤ ناں؟" اُس نے اُلٹا سوال کر دیا۔

"محبت کی فیور میں اس قدر بڑھ چڑھ کر بولنے والا لیا اتنا انجان ہو سکتا ہے؟"

"او ہائی سیمطلب تم سنجیدہ ہو۔" وہ حیران رہ گیا۔

"ہاں" عاتکہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں میں تم سے"

"پلیز عاتکہ!" اُس نے جھنجھلا کر قطع کلامی کی۔ " میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔"

"لیکن کیوں؟" وہ مستفسر ہوئی۔

"بس ہم صرف اچھے دوست ہیں اور ہمیشہ دوست رہیں گے۔"

"مگر جب تم چند ماہ کے بعد ہمیشہ کے لیے چلے جاؤ گے تو کیا یہ دوستی قائم رہ سکے گی؟"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہیں کراچی ہی میں رہوں گا۔"

"یہ بات تو تم مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو ورنہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے دل میں میرے لیے"

"ڈونٹ بی سلی عاتکہ۔" اُس نے تیز لہجے میں بات کاٹی۔ "میں تمہاری بہت قدر کرتا ہوں۔ میرے دل میں تمہارا ایک خاص مقام ہے اور وہ خاص مقام شاید میں کسی کو بھی نہ دے سکوں لیکن" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"لیکن کیا؟" وہ مضطرب ہو گئی۔



"ابھی میں نے ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا اور پھر یہ ضروری بھی تو نہیں ہے کہ انسان جس سے پیار کرے شادی بھی اُسی سے کرلے۔ کیا محبت کرنے کے لیے شادی کرنا لازمی شرط ہے؟" اُس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

عاتکہ کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ لمحہ بھر کے لیے اُس کا چہرہ متغیر ہو گیا مگر اُسے چہرے کے تاثرات چھپانے میں ملکہ حاصل تھا۔ وہ ایک دم کھلکھلا کر بولی۔ "ارے گھونچو! میں تو مذاق کر رہی تھی، تم تو سیریس ہی ہو گئے۔ میں جانتی ہوں کہ پاپا مجھے زہر دینا پسند کرلیں گے مگر کسی چودھری کے ساتھ مجھے دلہن بنا کر رخصت کرنے کے لیے راضی نہیں ہوں گے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" وہ قدرے پھیکا پڑ گیا۔ "تمہارے پاپا کی چودھریوں سے نفرت سمجھ میں نہیں آتی۔"

"تمہیں کیا دُکھ ہے اس بات کا؟" اُس نے انجانی سی خوشی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو۔" وہ بے تاثر آواز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہارے پاپا کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے بھلا اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور دکھ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اُن کی مرضی جس سے نفرت کریں، جس سے پیار کریں میرا کیا لینا دینا؟"

اُس کی وقتی خوشی کافور بن کر اُڑ گئی۔ دل مرجھا سا گیا تھا مگر لبوں پر بدستور ہنسی رقصاں تھی۔ عدنان حیدر بہت گہرا آدمی تھا۔ کسی اُلجھی ہوئی پہیلی کی طرح سمجھ میں نہ آنے والا۔ ایسے ہی وقت اُسے ایک شعر شدت کے ساتھ یاد آنے لگا مگر وہ اُسے زبان پر لانے کی ہمت نہ کر سکی بس دل ہی دل میں دوہرا کر رہ گئی۔

ہاتھ اُلجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں اب بتا! کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں۔

"اے کہاں کھو گئی ہو؟" عدنان نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

"پاپا کے متعلق سوچ رہی تھی۔" اُس نے سفید جھوٹ بولا مگر چہرے کے تاثرات سے اس جھوٹ کا بھرم قائم رکھا۔

"پاپا سے کبھی پوچھو ناں! کہ وہ چودھریوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

عاتکہ نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور سوچا کیا یہ وہی شخص ہے جو لمحے قبل اس بات کو پاپا کا ذاتی معاملہ کہہ رہا تھا۔ تاہم اپنی اس سوچ کو وہ لفظوں کا جامہ پہنانے سے قاصر رہی تاہم وہ ٹالنے والے انداز میں بولی۔ "کئی بار کوشش کر چکی ہوں مگر پاپا ہمیشہ میرے اس سوال پر چپ سادھ لیتے ہیں، کچھ بتاتے ہی نہیں۔"

"اور محبت کے نام سے کیوں چڑتے ہیں؟" عدنان نے ہنس کر پوچھا۔

وہ بولی۔" عدی! تم پاگل تو نہیں ہو کوئی بیٹی بھلا باپ سے اس قسم کا سوال پوچھ سکتی ہے؟ "

"کیوں کیا ایسا سوال پوچھنا جُرم ہے، یا پھر تم اُن سے ڈرتی ہو؟"

"نہیں۔" اُس نے منفی انداز میں سر ہلایا۔" بس میں اُن سے پوچھنا ہی نہیں چاہتی۔ کوئی بھی مشرقی لڑکی اپنے باپ سے ایسا سوال پوچھنے کی جسارت نہیں کر سکتی۔"

"اوکے تو پھر میں ہی پوچھ لوں گا، بس موقع ملنے کی دیر ہے۔"

"وہ تمہیں کچھ بھی نہیں بتائیں گے بلکہ اُلٹا تمہاری بے عزتی کر دیں گے۔"

"نہ بتائیں مگر میں اُن سے پوچھوں گا ضرور، بے عزتی ہوتی ہے تو ہونے دو۔" اُس نے اٹل انداز میں جواب دیا۔

"اوکے یہ حسرت بھی پوری کرلینا، مگر یہ یاد رکھنا کہ آئندہ تم نے پاپا سے کسی بھی موضوع پر بحث نہیں کرنی ورنہ ہماری دوستی میں دراڑ پڑ جائے گی۔" اُس نے اُٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے دھمکی دے رہی ہو؟" عدنان نے جیب سے والٹ نکالتے ہوئے پوچھا۔

"حقیقت بتا رہی ہوں۔ تم بس پاپا سے بحث مت کیا کرو مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"میری جیت بُری لگتی ہے؟" اُس نے ناراض انداز میں سوال کیا۔

"نہیں پاپا کو ہارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔"

عدنان نے والٹ سے ایک نوٹ نکال کر بل چکایا اور پلٹ کر بولا۔"میں اگر بحث میں تمہارے پاپا سے ہار جایا کروں تو کیا تمہیں اچھا لگے گا؟"

"پتا نہیں۔" وہ کش مکش کا شکار ہو گئی۔"اس بارے میں شاید میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں۔"

اس دوران وہ ریسٹورنٹ سے نکل کر گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔عدنان نے کہا۔" جب دو شخص آپس میں کسی موضوع پر بحث کرتے ہیں تو اُن میں سے کسی ایک کو ہارنا پڑتا ہے۔تم سچ بتاؤ تمہیں کس کی جیت اچھی لگتی ہے میری یا پھر اپنے پاپا کی؟"

"کسی کی بھی نہیں۔"

"یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔" وہ مصر ہوا۔

"عدی! سانڈوں کی لڑائی میں پودے کچلے جاتے ہیں۔ تیری اور پاپا کی بحث سے تکلیف مجھے پہنچتی ہے۔میں ایک کی ہار اور دوسرے کی جیت کی خوشی ایک ہی وقت میں کیسے منا سکتی ہوں؟ میرے سینے میں ایک ہی دل ہے جو تمہاری اور پاپا کی یکساں قدر کرتا ہے۔ پلیز یا تو پاپا سے بحث کرنا چھوڑ دو یا پھر مجھ سے اس قسم کے سوال مت پوچھا کرو۔" اُس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو بیٹھو۔" وہ گاڑی کی کھڑکی کھولتے ہوئے بولا۔ "آئندہ میں خیال رکھوں گا۔"

وہ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ عدنان نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ریورس گیئر لگایا، گاڑی کا رخ تبدیل کیا اور پھر دوبارہ گیئر لگاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

پروفیسر ارشد زمان سخت جھنجھلایا ہوا تھا۔ اُسے عدنان حیدر پر بے حد غصہ آرہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی اسٹوڈنٹ نے اُسے یوں چیلنج کیا تھا۔ اس سے قبل کبھی کسی نے کلاس کے دوران اُس سے بحث نہیں کی تھی۔ پروفیسر کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا مان تھا مگر آج یہ مان ٹوٹ گیا تھا اور یہ مان توڑنے والا کوئی دانش ور نہیں بلکہ ایک عام سا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ اگر کوئی پروفیسر، دانش ور یا تجزیہ نگار ہوتا تو شاید پروفیسر زمان کو اس قدر دُکھ نہ ہوا ہوتا۔ وہ خود کو لفظوں کا کھلاڑی سمجھتا تھا مگر ایک اناڑی نظر آنے والے نوجوان نے اُسے کلین بولڈ کر دیا تھا۔ اپنے پاس معلومات کا خزانہ رکھنے کے باوجود وہ اپنے ایک شاگرد سے بُری طرح ہار گیا تھا۔ ذلت کا احساس کسی زہریلے بچھو کی طرح اُسے ڈنک مار رہا تھا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی جا کر عدنان حیدر کو شوٹ کر دے مگر کسی دشمن سے بدلہ چکانے کے لیے جو ہمت درکار ہوتی ہے وہ اُس کے پاس نہیں تھی۔ وہ فطرتاً انتہائی بزدل انسان تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ڈر جانے والا، منٹوں میں مدِمقابل سے دب کر ہتھیار پھینک دینے والا۔ اپنی اس

بزدلی کے ہاتھوں اُس نے زندگی میں کئی بار ناقابلِ تلافی نقصانات اُٹھائے تھے لیکن ان نقصانات کاالزام وہ ہمیشہ مخالف فریق پر لگا دیتا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک اُس نے کبھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کی تھی۔وہ ہمیشہ خود کو ہی حق بجانب سمجھا کرتا تھا۔اسی ہٹ دھرمی کے سبب وہ کئی رشتوں اور مخلص دوستوں سے ہاتھ دھو چکا تھااور پھر ایک دن ایساہوا کہ اپنی ہر بات کو حرفِ آخر سمجھنے والا پروفیسر ارشدزمان بھری دنیامیں تنہارہ گیا،سوائے اپنی اکلوتی بیٹی عاتکہ زمان کے،اُس کے پاس کوئی رشتا رہااورنہ ہی دوست۔بس اب عاتکہ ہی اُس کی زندگی کا مقصدو محور تھی۔وہ بچپن ہی سے پروفیسر کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کرتی چلی آرہی چلی آرہی تھی۔پروفیسر اُس کے لیے آئیڈیل باپ تھا۔اُس نے کبھی بھی کسی معاملے میں باپ سے بحث نہیں کی تھی۔

عاتکہ کی ماں عائشہ بیگم توپروفیسر جیسے شخص کے ساتھ بمشکل دس برس ہی گزار سکی تھی۔اوریہ دس برس بھی اُس بچاری نے روتے اور کڑھتے ہوئے گزارے تھے۔پروفیسر نے ازدواجی زندگی کے دوران اُسے سکھ کم اوردکھ زیادہ دیے تھے۔پروفیسر کے مقابلے میں وہ کم پڑھی لکھی تھی اس لیے ہمیشہ بحث میں ہار جایاکرتی تھی۔پروفیسر اپنی ہر غلطی اُس کے سر تھوپ دیاکرتا تھااورجب وہ اپنے دفاع میں کچھ بولنے کی کوشش کرتی توپروفیسر اپنی



دانش ورانہ گفت گو سے اُسے چپ کرا دیا کرتا تھا۔وہ پروفیسر کے منطقی دلائل کے جوابات ہی نہیں دے پاتی تھی۔

عاتکہ اُس وقت تین برس کی تھی جب عائشہ بیگم دماغی نس پھٹنے کی وجہ سے اللہ کو پیاری ہو گئی۔اُس کے مرنے کے بعد پروفیسر نے اپنی تمام تر توجہ ننھی عاتکہ پر مرکوز کر دی اُس نے بیٹی کی ہر ضرورت کا خیال رکھا اور اُسے اس قدر توجہ اور پیار دیا کہ وہ ماں کی کمی محسوس ہی نہ کر سکی۔پروفیسر ہمیشہ بیٹی کی ہر خواہش کو مقدم سمجھتا تھا۔حتیٰ کہ بڑی ہو کر جب عاتکہ نے عدنان حیدر سے دوستی کی تو تب بھی پروفیسر نے کوئی اعتراض نہ کیا۔عدنان ایک اچھا لڑکا تھا اور پروفیسر اُسے پسند کرتا تھا لیکن آج عدنان کے ساتھ ہونے والی بحث کے بعد پروفیسر کے خیالات تبدیل ہو چکے تھے کہ اُسے بیٹی کی خوشی سے زیادہ اپنی انا عزیز تھی۔اب عدنان اُسے دنیا کا بدترین لڑکا لگ رہا تھا اور ایسے بدترین لڑکے سے اپنی بیٹی کی دوستی اُسے سخت تکلیف پہنچا رہی تھی۔

پروفیسر ایک اچھے خاصے شان دار گھر میں رہتا تھا۔اور یہ گھر اُس نے اپنی حلال کی کمائی سے تعمیر کیا تھا۔گھر کے کام کاج کے لیے اُس نے ایک ادھیڑ عمر کی نوکرانی رکھی ہوئی تھی۔فاطمہ نامی اُس عورت کو پروفیسر کے ہاں کام کرتے ہوئے طویل عرصہ ہو چکا تھا اور اب اُس کی حیثیت گھر کے ایک فرد کی سی ہو گئی تھی۔فاطمہ کا چونکہ آگے پیچھے کوئی نہیں

تھا اس لیے وہ بھی پروفیسر کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتی تھی۔ مگر اتنی طویل رفاقت کے باوجود پروفیسر نے ہمیشہ اُسے ایک نوکرانی ہی سمجھا تھا۔ البتہ عاتکہ کی فاطمہ سے خوب بنتی تھی۔ عاتکہ اُسے بچپن ہی سے بُوا کہتی چلی آرہی تھی اور فاطمہ نے بھی کبھی اُسے یہ احساس دلانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ محض ایک نوکرانی ہے۔ وہ عاتکہ کو سگی بیٹی کی طرح چاہتی تھی اور اُس کے پیار میں کسی قسم کی بناوٹ یا تصنع نہیں تھا۔ عاتکہ کے بچپن ہی سے وہ اُس کا بے حد خیال رکھتی چلی آرہی تھی۔ وہی اُسے نہلاتی دھلاتی تھی اور کسی ماں کی طرح اُس کی ہر ضرورت کا خیال رکھا کرتی تھی۔

پروفیسر نے کبھی اُن دونوں کے اس رشتے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ عاتکہ اُس کی موجودی میں بھی فاطمہ کو بُوا کہتی تھی۔ مگر پروفیسر کے لیے فاطمہ ہمیشہ ایک غیر عورت ہی رہی تھی۔ پروفیسر اب بھی اُسے باقاعدگی کے ساتھ تنخواہ دیتا تھا۔ گو کہ اب تنخواہ لینے کو فاطمہ کا دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ پروفیسر کو اچھی طرح جانتی تھی اس لیے انکار کرکے وہ یہ محفوظ ٹھکانا نہیں کھونا چاہتی تھی۔ بہت عرصہ پہلے ایک بار اُس نے تنخواہ لینے سے انکار کیا تھا تو تب پروفیسر نے اُسے دوٹوک الفاظ میں کہا تھا۔ ” فاطمہ! میں کسی کا احسان لینے کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں گھر میں کام کاج کے لیے رکھا ہوا ہے اگر تم تنخواہ نہیں لوگی تو پھر میں تمہیں اس گھر میں نہیں رکھ سکوں گا۔ میں کوئی اور کام والی ڈھونڈ لوں گا۔“



فاطمہ کو پروفیسر کے کہے گئے الفاظ آج بھی یاد تھے۔اُس وقت تو اُسے پروفیسر پر بے حد غصہ آیا تھا اور شاید وہ وہاں سے چلی بھی جاتی مگر عاتکہ کی محبت نے اُسے یہ انتہائی قدم اُٹھانے سے روک دیا تھا۔وہ بن ماں کی ایک معصوم بچی کو یوں چھوڑ کر جانے کی ہمت نہ کر سکی۔ان گزرے برسوں کے دوران وہ پروفیسر کو اچھی طرح جان گئی تھی کہ وہ بحث کرنے والے ہر شخص کو سخت ناپسند کرتا ہے،بس اپنی کہتا ہے دوسرے کی سننا اُسے ناگوار گزرتا ہے۔

اُس دن پروفیسر جب یونی ورسٹی سے گھر پہنچا تو لنچ کا ٹائم نکلنے والا تھا۔لیکن اُس کی بھوک اُڑ چکی تھی۔ڈائننگ روم کا رخ کرنے کی بجائے وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔اُس کا دماغ مسلسل عدنان حیدر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔اُس کی سماعتوں میں اب بھی عدنان حیدر کے کہے گئے الفاظ گونج رہے تھے۔" محبت عظیم ہوتی ہے سر عظیمکبھی نہ مٹنے والی جب کہ بھوک پیٹ بھرتے ہی مٹ جاتی ہے سیر ہونے کے بعد بھوک کا احساس تک باقی نہیں رہتا محبت تاج محل تعمیر کرتی ہے۔"

"ہونہہ محبت۔"پروفیسر منہ بناتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔" تاج محل محبت نے نہیں بلکہ ایک شہنشاہ کی دولت نے تعمیر کیا تھا،اُن مزدوروں اور راج مستریوں نے تعمیر کیا تھا جن کے نام تک تاریخ یاد نہ رکھ سکی۔"

پروفیسر یوں بُرے بُرے منہ بنا رہا تھا جیسے اُس نے کونین کی گولی چبا ڈالی ہو، پھر یونہی کسی خیال کے تحت اُس نے عاتکہ کو پکارنا شروع کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد عاتکہ کی بجائے فاطمہ اندر داخل ہوئی اور سلام کرنے کے بعد بولی۔ " صاحب! عاتکہ بی بی تو ابھی تک یونی ورسٹی سے واپس نہیں لوٹی۔ "

"کیوں؟" پروفیسر نے چلا کر پوچھا۔ "کیا اُس نے تمہیں لیٹ آنے کے متعلق بتایا تھا؟ "

"نہیں صاحب! اُس نے ایسا کچھ نہیں بتایا تھا۔ "

"میں جانتا ہوں وہ اُسی بد تمیز کے ساتھ گھوم رہی ہو گی۔ بس بہت ہو گیا آج کے بعد اُس کے ساتھ عاتکہ کا ملنا جلنا بند۔ "

"کیوں صاحب! کیا عدنان صاحب نے کچھ "

" صاحب مت کہو اُسے۔ " پروفیسر نے چلا کر قطع کلامی کی۔ " ایک نمبر کا بد تمیز اور بے شرم ہے وہ اُسے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز تک نہیں ہے۔ "

" صاحب! کھانا لگا دوں؟" فاطمہ نے موضوع بدل کر پوچھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ "

"کیا مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہے صاحب؟" فاطمہ نے سہم کر پوچھا۔

"بس تم جاؤ۔" پروفیسر چلایا اور فاطمہ حیرانی اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں کمرے سے باہر نکل گئی۔

پروفیسر دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔اُس کا دماغ مسلسل عدنان حیدر کے متعلق سوچ رہا تھا۔عدنان کے الفاظ کسی ہتھوڑے کے مانند اُس کی سماعتوں پر برس رہے تھے۔ بظاہر جسمانی طور پر وہ مکمل صحت مند انسان تھا۔بس کبھی کبھی اُسے ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہو جاتی تھی۔ اُس روز عدنان حیدر سے بحث کرنے کی وجہ سے اُس کا بی پی قدرے بلند تھا رہی سہی کسر گھر میں بیٹی کی عدم موجودی نے پوری کر دی تھی۔وہ جوں جوں عدنان حیدر کے بارے میں سوچتا گیا، اُس کا غصہ بھی بڑھتا گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس پر وہی کیفیت طاری ہوگئی جو بلند فشارِ خون کے مریضوں کی خاصیت ہوتی ہے۔پہلے اُسے کنپٹیوں پر دباؤ محسوس ہوا اور دل کی دھڑکن رفتار پکڑنے لگی۔اس کے بعد اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔اُس نے چلا کر فاطمہ کو پانی لانے کا حکم دیا اور پھر ٹیبل کی دراز کھول کر بی پی کنٹرول کرنے والی ٹیبلٹس تلاش کرنے لگا۔دراز میں ٹیبلٹس موجود نہیں تھیں۔اُس کا غصہ شدید تر ہو گیا۔اب اُس کا پورا بدن کانپ رہا تھا اور وہ بلند فشارِ خون کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہونے لگا۔

"کہاں مر گئی ہو فاطمہ۔" وہ حلق کے بل چلایا اور پھر لرزتا کانپتا بستر پر گر گیا۔ اب اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ بے ہوش ہونے سے قبل اُس نے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ اس کے بعد اُس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

عاتکہ عدنان کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو فاطمہ بُوا اُسے کاریڈور میں پریشانی کے عالم میں چکر لگاتی ہوئی نظر آئی ۔اُسے یوں بے چین دیکھ کر عاتکہ کا دل بے اختیار دھڑک اُٹھا۔ فاطمہ بُوا کی پریشانی بے سبب نہیں ہو سکتی تھی۔ یقیناً یہ کسی اہم واقعہ کا ردِ عمل ہی ہو سکتا تھا۔ فاطمہ بُوا کی نظر جونہی عاتکہ پر پڑی وہ تقریباً بھاگ کر اُس کے پاس پہنچ گئی۔ اُس کی رنگت اُڑی ہوئی تھی اور آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

"کیا بات ہے بُوا جی! آپ رو کیوں رہی ہیں؟" عاتکہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ وہ بی بی جی صابصاب اپنے کمرے میں" اُس نے کچھ بتانے کی کوشش کی مگر شدتِ غم سے اُس کی آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔

عاتکہ کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ تبھی وہ چلا کر بولی۔"کیا ہوا ہے پاپا کو آپ کچھ بولتی کیوں نہیں ہیں؟"



فاطمہ بدستور روئے جارہی تھی۔ اُس نے لب کھولنے کی کوشش کی مگر اُس کے ہونٹ بولنے کے انداز میں لرز کر رہ گئے۔

عاتکہ اُس سے مزید کوئی سوال کیے دوڑتی ہوئی باپ کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ عدنان بھی اُس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلا آیا تھا۔ کمرے میں پروفیسر اپنے بیڈ پر آڑی ترچھی حالت میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر پڑا ہوا تھا۔ عاتکہ نے چلا کر اُسے پکارا۔ ”پاپا پاپا“ اور پھر روتے ہوئے اُس سے لپٹ گئی۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر عدنان کچھ دیر کے لیے تو بے حد پریشان ہو گیا، مگر جلد ہی اُسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔ پروفیسر بالکل بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ عاتکہ کے لپٹنے پر بھی اُس کے جسم میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ وہ عالم رنگ و بو سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ چکا ہے اور کبھی نہ اُٹھنے کے لیے سو چکا ہے۔ اُس نے آگے بڑھ کر پروفیسر کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ نبض چل رہی تھی لیکن رفتار معمول کے مطابق نہیں تھی۔ اُسے فوراً ہاسپٹل پہنچانا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ عاتکہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں بولا۔ ”فکر نہ کرو عاتکہ! سر زندہ ہیں۔ تم حوصلہ رکھو ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم انھیں فوراً ہاسپٹل لے چلتے ہیں۔“



عاتکہ کو تسلی دینے کے بعد وہ بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔بنگلے کے مین گیٹ کے سامنے ہی اُس کی نئے ماڈل کی پراڈو جیپ پارک تھی۔اُس نے نہایت ہی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مین گیٹ کو مکمل کھول دیا۔وہ بھاگتا ہوا گاڑی میں بیٹھا، گاڑی اسٹارٹ کی اور بنگلے کے اندر لا کر کاریڈور کے عین سامنے روک دی۔ گاڑی کا انجن بند کیے بغیر وہ تیزی سے نیچے اُترا اور دوڑتا ہوا پروفیسر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔عاتکہ بدستور روئے جارہی تھی جب کہ فاطمہ بُوا اُسے تسلی دینے کی کوشش کررہی تھی۔وہ کچھ بولے بغیر آگے بڑھا ، پروفیسر کو اُٹھا کر کندھے پہ ڈالا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔عاتکہ اور فاطمہ بُوا بھی اُس کے پیچھے پیچھے باہر آ گئیں۔

اس دوران عدنان پروفیسر کو گاڑی کی عقبی سیٹ پر لٹا چکا تھا۔عاتکہ بھی باپ کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ گاڑی کا انجن پہلے ہی آن تھا۔عدنان نے گیئر لگاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھادی۔کھلی سڑک پر پہنچتے ہی اُس نے گاڑی کی رفتار بڑھادی تھی۔عاتکہ اب بھی رو رہی تھی مگر آواز دھیمی تھی۔عدنان نے جیب سے موبائل فون نکالا اور کسی ڈاکٹر سے گفت گو کرنے لگا۔ڈاکٹر سے چند باتیں کرنے کے بعد اُس نے کال ڈس کنکٹ کرتے ہوئے فون جیب میں رکھ لیا۔

”کیا سر دل کے مریض ہیں؟“اُس نے بغیر پیچھے دیکھے عاتکہ سے پوچھا۔



"نہیں۔" عاتکہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ اگر پاپا کو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کروں گی۔"

"مگر کیوں اس میں میرا کیا دوش ہے؟" اُس نے حیرت سے استفسار کیا۔

وہ تلخ لہجے میں بولی۔" یہ سب تمہاری فضول بحث کا نتیجہ ہے۔ فاطمہ بُوا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ پاپا تم پر بے حد غصہ تھے اور ہائی بلڈ پریشر کا مریض ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے اُن کا غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا گیا ہو گا۔ انجام کار وہ اس حال کو پہنچ گئے۔"

"آئی ایم رئیلی سوری عاتکہ۔" وہ نادم لہجے میں بولا۔" لیکن میرا نہیں خیال کہ سر کی اس حالت کی وجہ میری بحث ہو سکتی ہے۔ میں اس سے قبل بھی اُن سے کئی بار بحث کر چکا ہوں۔ پہلے تو کبھی اُن کے ساتھ ایسا نہیں ہوا، تو پھر آج"

"آج اُن کے پاس بی پی کنٹرول کرنے والی ٹیبلٹس نہیں تھیں۔" عاتکہ نے قطع کلامی کی۔

"عاتکہ! میں تم سے شرمندہ ہوں۔ دراصل میں سر کی بیماری سے لاعلم تھا۔ ورنہ کبھی بھی اُن سے بحث نہ کرتا۔"

"کیا تمہاری شرمندگی پاپا کی اس تکلیف کا ازالہ کر سکتی ہے؟" عاتکہ کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔



وہ بولا۔" تم حوصلہ رکھو ان شاء اللہ سر کو کچھ بھی نہیں ہو گا۔"

"کیسے حوصلہ رکھوں؟" وہ پھٹ پڑی۔" پاپا کے علاوہ کون ہے میرا؟ بھری دنیا میں سوائے پاپا کے آج تک میں نے کسی رشتادار کی صورت تک نہیں دیکھی۔ ایک ماں تھی وہ بھی میرے بچپن میں ہی گزر گئی۔"

عدنان سے اُس کے سوال کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔ سو وہ چُپ ہو گیا۔ ویسے بھی اُس وقت اُن کی گاڑی ایک نجی ہاسپٹل کا مین گیٹ کراس کرتے ہوئے اندر داخل ہو چکی تھی۔ عدنان چونکہ راستے ہی میں اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے بات کر چکا تھا۔ اس لیے بغیر کسی تاخیر کے پروفیسر کو ایڈمٹ کر دیا گیا۔ عدنان اور عاتکہ ڈاکٹر کے آفس روم میں ہی بیٹھ گئے۔ عاتکہ کے چہرے پر بدستور مردنی چھائی ہوئی تھی اور وہ نظریں نیچی کیے بیٹھی ہوئی تھی۔ عدنان اُس کی حالت دیکھ کر اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا اور دل ہی دل میں پروفیسر کی زندگی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پروفیسر کے علاوہ عاتکہ کا کوئی نہیں ہے۔ خدانخواستہ اگر پروفیسر کو کچھ ہو جاتا تو عاتکہ بھری دنیا میں تنہا رہ جاتی۔ اُس کی زندگی عدنان کے سامنے کھلی ہوئی کتاب کے مانند تھی۔

یونہی بیٹھے بیٹھے اُن کے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ گزر گیا۔ عدنان نے کوشش کرتے ہوئے بارہا لب کھولنے کی کوشش کی مگر عاتکہ کو تسلی دینے کی ہمت نہ کر سکا۔



اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لفظ انسان کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔منہ میں زبان رکھتے ہوئے بھی وہ خود کو گونگا تصور کرتا ہے۔عدنان بھی اُس وقت اسی کیفیت سے گزر رہا تھا۔عاتکہ کی نم آلود آنکھیں دیکھ کر وہ خود کو اُس کا مجرم تصور کر رہا تھا۔پروفیسر کی اس حالت کا ذمہ دار وہی تھا۔وہ اگر پروفیسر سے بحث نہ کرتا تو ایسی صورتِ حال پیش ہی نہ آتی۔اسی خاموشی میں مزید چند لمحات گزر گئے۔تب وہ پہل کرتے ہوئے بولا۔"عاتکہ! میں میں تم سے سخت شرمندہ ہوں۔لیکن خدا جانتا ہے کہ یہ سب کچھ انجانے میں ہوا۔مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ سر اس قدر میری بحث کا اثر لیں گے۔خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں سر کے سامنے زبان ہی نہ کھولتا۔مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ سر ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہیں؟"

"پاپا دل کے بہت اچھے ہیں عدی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔"مگر جب کوئی شخص اُن کے سامنے محبت کی بڑائی بیان کرتا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ وہ محبت سے کس قدر نفرت کرتے ہیں؟"

"مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔" اُس نے تائید کی۔"ورنہ بحث تو میں اُن سے کئی بار کر چکا ہوں۔مجھے لگتا ہے کہ سر نوجوانی میں محبت کرتے رہے ہیں اور بے وفائی کا شکار بن چکے ہیں۔محبت سے اس قدر نفرت صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے اُس کی محبت نے ٹھکرا دیا ہو۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ میں نے کبھی پاپا سے اُن کے ماضی متعلق"

ایسے ہی وقت عدنان کا دوست ڈاکٹر سہیل نیازی اندر داخل ہوا اور عاتکہ کی بات ادھوری رہ گئی۔

"ڈونٹ وری عدنان۔" اُن کی اُتری ہوئی شکلیں دیکھ کر ڈاکٹر نے مطمئن انداز میں کہا۔" اب وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ تم لوگ اُن سے مل سکتے ہو۔"

"تھینکس گاڈ۔"عدنان نے اطمینان بھری سانس لی اور پھر عاتکہ سے بولا۔" چلو سر سے ملتے ہیں۔ میں اُن سے سوری بھی کرلوں گا۔"

وہ بولی۔" معافی مانگنے کے لیے یہ موقع مناسب نہیں ہے۔ ابھی تم اُن کے سامنے مت جاؤ ،اُن کی طبیعت دوبارہ بھی بگڑ سکتی ہے۔"

عاتکہ کی بات سن کر لمحہ بھر کے لیے تو اُس کی رنگت متغیر ہو گئی لیکن پھر وہ سنبھل کر بولا۔"اِٹس اوکے مجھے ابھی سر کے سامنے نہیں جانا چاہیے۔ ٹھیک ہے تم چلی جاؤ میں یہیں بیٹھ کر تمہارا انتظار کرتا ہوں۔"

"پلیز عدی! مائنڈ مت کرنا۔" وہ قدرے شرمندہ ہو کر بولی۔" میں جانتی ہوں کہ یہ بداخلاقی ہے لیکن کیا کروں مجبوری میں ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔"

"میں بھلا کیوں مائنڈ کروں گا؟" وہ مسکرایا اور پھر ڈاکٹر نیازی کی طرف متوجہ ہو گیا، جو متحیر ہو کر اُن دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

"یہ کیا چکر ہے بھئی؟" عاتکہ کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"چکر وکر کوئی نہیں ہے یار! بس عاتکہ کے پاپا مجھے پسند نہیں کرتے۔"

"دیکھو عدنان! تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔ عاتکہ تم سے اس لہجے میں بات کر ہی نہیں سکتی۔ کوئی نہ کوئی چکر ضرور ہے۔"

"کچھ بھی نہیں ہوا یار۔" اُس نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا۔ لیکن جب ڈاکٹر نیازی کا اصرار جاری رہا تو اُسے ساری کہانی سنانی ہی پڑی۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔" ساری کہانی سننے کے بعد ڈاکٹر نے ہنس کر کہا۔ "پھر تو سمجھو تم بے موت مارے گئے۔"

"کیا مطلب؟"

ڈاکٹر بولا۔ "تم عاتکہ سے محبت کرتے ہو اور پروفیسر محبت کا دشمن نمبر ایک لگتا ہے۔ تیری کشتی تو بیچ منجدھار میں ڈوبنے والی ہے۔ تم پروفیسر کو کبھی بھی راضی نہیں کر سکتے۔"

"احمق ہو تم۔" عدنان نے قہقہہ لگایا۔ "عاتکہ اور میں صرف اچھے دوست ہیں۔ دوستی کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی رشتا نہیں ہے۔"



"وقت آنے پر تم سے پوچھوں گا چودھری صاحب!" ڈاکٹر کے انداز میں تمسخر تھا۔ "بہت جلد تم دونوں کے بیچ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔"

"اچھا مذاق چھوڑو، کچھ سر کے متعلق بتاؤ؟" عدنان نے موضوع بدل کر پوچھا۔

"وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ بس بلند فشار خون کی وجہ سے یہ سب کچھ وقوع پذیر ہوا ہے۔"

"مطلب سر کو کوئی ہارٹ پرابلم نہیں ہے؟"

"فی الحال تو ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ مگر بعد میں یہ شکایت ہو بھی سکتی ہے یہ مسئلہ توجہ طلب ہے۔ پروفیسر کو پرہیزی کھانے کے ساتھ ساتھ ریگولرلی ورزش کرنے کی بھی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر نیازی نے جواب دیا اور عدنان نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

عاتکہ کمرے میں داخل ہوئی تو پروفیسر سفید بستر پر آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے پر قدرے نقاہت کے آثار تھے۔ قدموں کی چاپ سن کر اُس نے آنکھیں کھولیں۔ لمحہ بھر کے لیے عاتکہ کی طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ اُس نے عاتکہ کو جن نظروں سے دیکھ تھا۔ اُن میں اپنائیت کی جگہ ناراضی اور سرد مہری تھی۔ عاتکہ کے دل پر چوٹ سی لگی۔ کوشش کے باوجود وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکی۔ چند لمحے تو وہ

پروفیسر کی طرف اُمید بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی مگر جب پروفیسر اُس کی طرف متوجہ نہ ہوا تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔"پاپا!میں عاتکہ ہوں کیا آپ مجھے معاف نہیں کریں گے؟"

پروفیسر نے کوئی جواب نہ دیا۔عاتکہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ایسے ہی وقت وہ روتی ہوئی پروفیسر سے لپٹ گئی۔" پاپاپاپا پلیز مجھے معاف کر دیجیے آئندہ ایسا کبھی بھی نہیں ہو گا میں شرمندہ ہوں پاپا۔"

بیٹی کو آنسوؤں کے ساتھ یوں روتے دیکھ کر پروفیسر کے ضبط کے بندھن بھی ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔دوسرے ہی لمحے اُس کا دایاں ہاتھ اُٹھا اور عاتکہ کے سر کے بال سہلانے لگا۔یہ واضح طور پر اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ عاتکہ کو معاف کر چکا ہے۔عاتکہ بدستور اُس کے سینے پہ سر رکھ کر لیٹی رہی۔ایسا کرنا اُسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔پروفیسر کی اُنگلیاں اُس کے بالوں میں متحرک رہیں۔وہ باپ کی اُنگلیوں میں چھپی شفقت محسوس کر رہی تھی۔محبت کے کئی روپ ہوتے ہیں،یہ بھی محبت ہی کا ایک روپ تھا لیکن شاید پروفیسر اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھا۔وہ جو محبت کا دشمن تھا اُسے بیٹی کی محبت نے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"پاپا! آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے ناں؟" پروفیسر کی سماعتوں سے عاتکہ کی آواز ٹکرائی۔

"میں بھلا اپنی گڑیا سے روٹھ سکتا ہوں؟" اُس کا لہجہ پدری شفقت سے معمور تھا۔

وہ بولی۔ آپ بہت اچھے ہیں پاپا! میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے آپ جیسا پیار کرنے والا پاپا ملا ہے۔"

"لیکن میں خود کو خوش قسمت نہیں سمجھتا۔" اُس نے شکوہ کیا۔ "تم پاپا کا دل کیوں دُکھاتی ہو؟"

"پاپا! یہ سب کچھ میں نے جان بوجھ کر تو نہیں کیا؟ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ آپ ناراض ہو جائیں گے تو میں کبھی بھی اُس کے ساتھ نہ جاتی۔"

پروفیسر بولا۔" وہ اچھا لڑکا نہیں ہے گڑیا! بہت بدتمیز ہے۔ اُسے بولنے تک کی تمیز نہیں ہے۔ تم اُس سے نہ ملا کرو۔"

"ٹھیک ہے پاپا! اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو میں اُس سے کبھی نہیں ملوں گی۔ اُس سے زیادہ مجھے اپنے پاپا کی خوشی عزیز ہے۔"

"میری اچھی گڑیا۔" پروفیسر نے فرطِ مسرت سے اُس کی پیشانی چُوم لی اور پھر پوچھا۔" مجھے یہاں کون لایا ہے؟"



سوال غیر متوقع تھا۔وہ ایک دم گڑبڑا گئی۔باپ سے جھوٹ بھی نہیں بول سکتی تھی اور سچ بولنے میں بھی رسک تھا۔لہٰذا وہ کش مکش کا شکار ہو گئی۔

پروفیسر اُسے کش مکش کا شکار دیکھ کر بولا۔"میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت کس کیفیت سے گزر رہی ہو بہر کیف اب میں اُس نالائق کی گاڑی میں واپس نہیں جاؤں گا۔اُسے بول دو کہ میں اُس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"اوکے پاپا!میں گھر سے اپنی گاڑی لے آتی ہوں لیکن" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"لیکن کیا؟"پروفیسر کے انداز میں حیرت تھی۔

"پاپا!وہ وہ عدیا آپ سے سوری بولنا چاہتا ہے؟"اُس نے بمشکل جواب دیا۔

"میں اُس کی سوری پر لعنت بھیجتا ہوں۔" پروفیسر نے غصے کے عالم میں کہا۔" اُسے کہو کہ کلاس کے علاوہ میں اُس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہوں۔"

"جی پاپا۔" وہ فرماں برداری سے سر جھکاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

بات بہت معیوب تھی مگر وہ پاپا کو انکار کرنے کی ہمت نہ کر سکی۔وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اُس نے پاپا سے بحث چھیڑ دی تو اُس کی طبیعت دوبارہ بگڑنے کا اندیشہ تھا۔عدنان کمرے کے سامنے کاریڈور میں ٹہل رہا تھا۔اُسے کمرے سے نکلتے دیکھ کر تیزی سے اُس کی طرف بڑھا اور بولا۔"سر کی طبیعت کیسی ہے۔وہ ٹھیک تو ہیں ناں؟"

"ہاں۔" اُس نے پھیکے سے انداز میں جواب دیا۔" پاپا بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں لیکنوہ ہتم سے ملنا نہیں چاہتے۔"

عدنان کو بے حد سبکی محسوس ہوئی مگر وہ ضبط کر گیا۔عاتکہ نے کہا۔" عدی !اس میں میرا کوئی دوش نہیں ہے۔پلیز تم مجھ سے ناراض مت ہونا۔"

"ارے بھئ !میں بھلا تم سے کیوں ناراض ہونے لگا؟"وہ ہنس دیا۔ مگر یہ ہنسی صرف نام کی ہنسی تھی۔اندر سے احساسِ ذلت اُسے کچوکے لگا رہا تھا۔

وہ بولی۔" عدی !میں جانتی ہوں کہ اس وقت تم خود کو بہت ہی چھوٹا محسوس کر رہے ہو لیکن یہ بھی توسوچو ناں کہ پاپا کی جو حالت ہے اُس کے پیشِ نظر"

"عاتکہ !خود کو کیوں ہلکان کر رہی ہو؟"اُس نے ایک دم ایک جان دار قہقہہ لگایا۔"میں نے کوئی انسلٹ وغیرہ محسوس نہیں کی ہے۔تمہارے پاپا میرے سر ہیں۔یعنی کہ میرے اُستاد ہیں اور اُستاد تو روحانی باپ ہوتا ہے۔اب اگر ایک باپ بیٹے کو بُرا کہتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ خطاکار بیٹا ہے نہ کہ باپ؟ایسے بیٹے کو باپ سے ناراض ہونے کے بجائے اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔"

"تھینکس عدی!" سر سے بوجھ ہٹتے ہی وہ کھل اُٹھی۔

"نو دوستوں میں تھینکس کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔"



"تو چلو پھر مجھے گھر تک ڈراپ کر دو۔"

"لیکن وہ سر"

"اُنھوں نے ہی تو مجھے گاڑی لانے کے لیے کہا ہے۔" عاتکہ نے قطع کلامی کی۔

"یار! گاڑی سے کیسی ناراضی؟ قصور میں نے کیا ہے نہ کہ میری گاڑی نے؟" عدنان نے احتجاج کیا۔

عاتکہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے اس انداز پر ہنس دی۔

وہ بولا۔" دانت مت نکالو، مجھے تو تم بھی سر کی طرح خبطی لگتی ہو۔"

"ظاہر ہے پاپا کی بیٹی ہوں۔" وہ دوبارہ ہنس دی۔

"مطلب میں ایک نہیں، دو دو خبطیوں کے بیچ پھنس گیا ہوں یا خدا! میرا کیا بنے گا؟"

"وقت آنے پر کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گا۔" عاتکہ نے ذو معنی انداز میں جواب دیا اور عدنان بغلیں جھانکنے لگا۔

"چلو تجھے گھر چھوڑ دوں۔" بالکل غیر متوقع طور پر وہ سنجیدہ ہو گیا۔

عاتکہ نے قدرے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا اور پھر بغیر کچھ بولے ہاسپٹل کے پارکنگ ایریے کی طرف چل دی۔

"مجھے لگتا ہے تم ناراض ہو گئی ہو؟" عدنان نے چلتے چلتے سوال کیا۔



"غلط فہمی ہے تمہاری۔" اُس نے بے تاثرانداز میں جواب دیااور عدنان کا دل کٹ کر رہ گیا۔

☆☆☆

زندگی دوبارہ معمول پر آگئی تھی۔ مگراب عاتکہ اور عدنان کے ملنے پرپابندی تھی۔پروفیسر نے سختی کے ساتھ عاتکہ کو منع کر دیاتھا کہ وہ عدنان سے بالکل نہ ملے۔اب وہ خود ہی اپنی گاڑی میں عاتکہ کویونی ورسٹی لے جاتا تھااورواپسی پر بھی اُسے ساتھ لانا نہیں بھولتا تھا۔چند دن توعاتکہ نے جیسے تیسے گزار لیے مگر پھر وہ اس روٹین سے تنگ آگئی۔وہ عدنان سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ان چند دنوں کی جدائی نے اُس پراس قدراثرڈالا کہ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔پروفیسر اُس کی یہ حالت دیکھ کرپریشان ہو گیا۔دسویں دن جب وہ پروفیسر کے ساتھ یونی ورسٹی سے واپس لوٹی تو اُس نے لنچ کرنے سے انکار کر دیا۔پروفیسر نے وجہ پوچھی تو وہ کچھ بتانے کے بجائے رونے لگی۔پروفیسر بچہ نہیں تھا کہ اُس کے رونے کی وجہ نہ سمجھ سکتا۔بیٹی کے آنسو گواہی دے رہے تھے کہ وہ عدنان حیدرپر دل ہار بیٹھی ہے۔پروفیسر چند لمحے تو اُس کے بولنے کا منتظر رہا مگرجب وہ کسی طرح بھی نہ بولی توپروفیسر کو خود ہی پہل کرنا پڑی۔

"دیکھو عاتکہ!" پروفیسر نے ناصحانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔"تم ابھی ناسمجھ ہو، تمہیں اچھے بُرے کی پہچان نہیں ہے۔عدنان ایک امیر زادہ ہے اور یہ امیر محبت کو محض دل لگی سمجھتے ہیں۔میں جانتاہوں کہ وہ تجھ سے فلرٹ کررہاہے۔اُسے اگر تجھ سے واقعی محبت ہوتی تو وہ کب کااظہار کرچکا ہوتا۔یوں دوسری لڑکیوں کے آگے پیچھے نہ گھوم رہا ہوتا۔امیر کسی سے محبت نہیں کرتے۔"

"پاپا!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔" آپ میرے ایک سوال کاجواب دیں گے؟"

"کیساسوال؟"پروفیسر نے حیران ہوکر پوچھا۔

"آپ محبت سے اس قدر چڑتے کیوں ہیں؟"

"اس لیے کہ میں محبت کو محض وقت کازیاں سمجھتاہوں۔"

"نہیں۔" اُس نے نفی میں سرہلایا۔" بات کچھ اور ہے۔آپ مجھ سے کچھ چھپارہے ہیں؟
"

"یہ تمہاراوہم ہے عاتکہ!میں سچ کہہ رہاہوں۔"

"وہم نہیں ہے پاپابلکہ مجھے یقین ہے کہ آپ نے نوجوانی میں کسی سے محبت کی ہے۔جس میں آپ کوسوفی صدناکامی ہوئی ہے۔"

وہ بولا۔" تم احمق ہوباپ پہ شک کررہی ہومیں نے کبھی سے سے محبت نہیں کی ہے۔"

"اوکے تو پھر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ آپ نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی؟ "

"مجھے لگتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

"میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے پاپا! پلیز مجھے اپنے ماضی کے بارے میں بتادیں کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ کسی سے بے وفائی کر چکے ہیں؟"

"عاتکہ!" پروفیسر چلایا۔ "تم ہوش میں تو ہو کیا کہہ رہی ہو اور کس سے کہہ رہی ہو؟ "

وہ بولی۔ " پاپا! دُکھ شیئر کرنے سے اُن کا احساس کم ہو جاتا ہے اور پھر میں تو آپ کی بیٹی ہوں کیا مجھے اتنا بھی حق حاصل نہیں ہے کہ میں اپنے پاپا کے ماضی کے بارے میں جان سکوں؟ "

پروفیسر ایک دم چُپ ہو گیا۔ یوں جیسے چابی والے کھلونے کی چابی ختم ہو گئی ہو۔ عاتکہ بغور اُس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک ہی پروفیسر کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ اندر کا درد نمکین پانی کا روپ دھارے باہر اُبلنے لگا۔

☆☆☆

”ارشی! تم میرے بھائیوں سے بات کیوں نہیں کرتے۔ہم کب تک یوں چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے؟“صفیہ نے سوال کیا۔

وہ بولا۔” صفیہ! مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ تمہارے بھائیوں کے سامنے ہاتھ پھیلا سکوں۔“

”ہمت نہیں تھی تو پھر پیار کیوں کیا؟“

”پیار کوئی جان بوجھ کر تھوڑی کرتا ہے۔یہ تو بس ہو جاتا ہے۔اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے؟“

وہ بولی۔” تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے مجھے سپنے دکھائے ہیں اور اب مجھے اُن سپنوں کی تعبیر چاہیے؟“

”خوابوں اور سپنوں کی تعبیر بازار میں بکتی تو میں اپنا آپ بیچ کر بھی خرید لاتا۔ مگر افسوس کہ یہ جنس نایاب دنیا کے کسی بازار میں نہیں بکتی۔“

”تم ایک بار میرے بھائیوں سے بات کر کے تو دیکھو، کیا پتا وہ مان جائیں۔“ صفیہ نے مشورہ دیا۔

”نہیں صفیہ! میں بے موت مرنا نہیں چاہتا۔ تم خود کیوں نہیں بات کرتیں اپنے بھائیوں سے؟“



"سوری میں یہ بے شرمی والا کام نہیں کر سکتی۔" اُس نے انکار میں سر ہلایا۔"بھائی مجھے زندہ زمین میں گاڑ دیں گے لیکن میری بات نہیں مانیں گے۔میں اُنھیں اچھی طرح جانتی ہوں۔تاہم تمہاری بات وہ ضرور سنیں گے۔ماننا یا انکار کرنا اُن کی صوابدید پر منحصر ہے۔"

"پھر تو ہمارا ملاپ ناممکن ہے۔" اُس نے متاسف لہجے میں جواب دیا۔

"مطلب تم بات نہیں کرو گے؟"

"بالکل نہیں کروں گا۔" اُس نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

"یعنی تم مجھے یہ بے شرمی والا کام کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہو؟"اُس نے طنزاً پوچھا۔

وہ بولا۔" میں نے ایسا کب کہا ہے؟"

"کہا نہیں ہے مگر تمہارا رویہ تو یہی ظاہر کر رہا ہے کہ مجھے ہی اپنے بھائیوں سے بات کرنا پڑے گی۔"

"فی الحال بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پہلے مجھے اپنے قدموں پہ کھڑا ہونے تو دیجیے۔جب میں کچھ بن جاؤں گا تو پھر تمہارے بھائیوں سے بات بھی کر لوں گا۔"

"کاش تمہارے ماں باپ زندہ ہوتے تو آج ہم دونوں یوں مجبور نہ ہوتے۔"

وہ بولا۔" ماں باپ تو تمہارے بھی نہیں ہیں اور شاید یہی ہم دونوں کی بد قسمتی ہے۔"



وہ سر جھکا کر سوچوں میں غرق میں ہو گئی۔جب کہ ارشد زمان پریشانی کے عالم میں اُس کی شکل دیکھنے لگا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" چند لمحوں کے بعد ارشد زمان نے سوال کیا۔

"سوچ رہی ہوں کہ مجھے تم سے محبت کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔"

"پشیمان ہو تو راستا کھلا ہے۔میں تجھے نہیں روکوں گا۔" اُس نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔

"یعنی تجھے مجھ سے بچھڑنے کا کوئی غم نہیں ہو گا؟" صفیہ نے حیرت اور دُکھ کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا۔

"کیوں نہیں ہو گا؟ کیا میں نے ایسا کہا ہے؟"

"ارشی! پلیز کچھ کرو۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔" ورنہ بھائی مجھے کسی جاگیر دار کے گنوار بیٹے کے پلے باندھ دیں گے۔"

"کیا تم اپنے حق کے لیے بھائیوں سے نہیں لڑ سکتیں؟" جواب دینے کے بجائے اُس نے اُلٹا سوال کر دیا۔

"لڑ سکتی ہوں مگر پہل تجھے کرنا پڑے گی۔تم ایک دفعہ رشتا تو مانگو باقی میں خود سنبھال لوں گی۔"



"کچھ بنے بغیر میں یہ قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ تمہیں"

"تب تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔" صفیہ نے قطع کلامی کی۔

پھر اس سے قبل کہ وہ صفیہ کی بات کا جواب دیتا ایک بڑی سی جیپ اُن کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ جیپ کو دیکھتے ہی صفیہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ڈرائیور نے اُس کے لیے گاڑی کی کھڑکی کھولی ،صفیہ نے ارشد پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور پھر جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اُس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

چودھری فرمان حیدر ایک سجے سجائے خوب صورت سے کمرے میں بڑی بے چینی کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے اور ہاتھوں کی مٹھیاں یوں بھنچی ہوئی تھیں جیسے وہ کوئی رنگ میں اُترا ہوا ریسلر ہو اور اُسے اپنے حریف کا انتظار ہو۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک دبیز صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُس کی نظریں کمرے کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ شاید وہ کسی کا منتظر تھا۔ چند لمحے قبل ہی اُسے ایک گم نام فون کال موصول ہوئی تھی کہ وہ اپنی نوجوان بہن پہ نظر رکھے ورنہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں رہے گا۔ فون کرنے والے نے اپنا نام و پتا بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ بس صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ اُس کا خیر خواہ ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اُس کا غصہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک وہ

صوفے سے اُٹھا اور پھر حلق کے بل چلا کر کسی سکینہ نامی خاتون کو آوازیں دینے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نوجوان لڑکی کمرے میں داخل ہو کر سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ''حکم سائیں! سکینہ حاضر ہے۔''

''صفیہ پہنچی ہے کہ نہیں؟'' اُس نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں پوچھا۔

''سائیں! دلاور اُسے لینے کے لیے جا چکا ہے۔ مگر ابھی تک واپس نہیں آیا۔'' سکینہ نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

''کیوں واپس نہیں آیا کیا کر رہا ہے وہ اُلو کا پٹھا؟'' چودھری نے گرج کر پوچھا۔

''مممجھے کیا پتا سائیں؟'' وہ مزید سہم گئی۔

''تمہیں پتا ہونا چاہیے، دلاور تمہارا شوہر ہے۔''

''سائیں! وہ بی بی جی کبھی کبھار اپنی کسی سہیلی سے بھی ملنے چلی جاتی ہے۔ کیا پتا آج بھی بی بی جی''

''کیا بکواس کر رہی ہو؟'' چودھری نے قطع کلامی کی۔ ''کون ہے اُس کی سہیلی، کیا تم اُسے جانتی ہو؟''

''نننہیں سائیں ممیں تو نہیں جانتیشاشاید دلاور کو پتا ہو؟'' سکینہ نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تم دفع ہو جاؤ، دلاور جب واپس آجائے تو اُسے میرے پاس بھیج دینا۔"

وہ سلام کرتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔جب کہ چودھری نے ایک بار پھر بے چینی کے عالم میں ٹہلنا شروع کر دیا۔اب اُسے وہ گم نام فون کال حقیقت پر مبنی لگ رہی تھی۔وہ جو کوئی بھی تھا بہر کیف جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

لگ بھگ پچیس منٹ کے بعد دلاور اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا اور چودھری کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔چودھری فرمان چند لمحے تو اُسے گھورتا رہا پھر گرج کر پوچھا۔"

تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟"

"وہ وہ چودھری جیدیر میں نے تو نہیں لگا ئیدر اصل صفیہ بی بی اپنی ایک سہیلی سے ملاقات"

"دلاور!" چودھری نے غضب ناک انداز میں اُس کی بات کاٹی۔" تم جھوٹ بول رہے ہو مجھے ساری بات کا پہلے ہی سے علم ہے۔لیکن میں تمہاری زبان سے ساری کہانی سننا چاہتا ہوں۔جھوٹ بولو گے تو جان سے جاؤ گے اور سچ بتاؤ گے تو انعام پاؤ گے۔فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"وہ وہ چودھری جیربّ دی سوں مںمیں بالکل بے قصور ہوں جی۔"دلاور نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔

چودھری گرجا۔"اُلو کے پٹھے!جو میں نے پوچھا ہے اُس کا جواب دو ورنہ زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔"

"چودھری جی!صفیہ بی بی ایکا یکلڑکے سے ملتی ہے جیپر ربّ دی سوںاسمیں میرا ککلکوئی دوش نہیں ہے جی۔"

دلاور نے اٹکتے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"کب سے مل رہے ہیں وہ دونوں؟" غیر متوقع طور پر چودھری نے نرم انداز میں پوچھا۔

"چھے مہینے ہو گئے جی۔"

"نمک حرام ہو تم۔" چودھری گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے گرجا۔"چھے مہینوں سے تم اُس کے رازدار ہو اور مجھے اب بتا رہے ہو کیوں؟"

"وہچودھری جی!دراصلصفیہ بی بی نے مجھے دھمکی دی تھیکہ میں نے کسی کو بھی یہ بات بتائی تو وہ مجھے کسی جھوٹے الزام میں پھنسوا کر مروا ڈالے گیمیں کیا کرتا جیزندگی تو سبھی کو پیاری ہوتی ہے ناں!اس لیے میں اپنی جان کے خوف سے خاموش رہا۔"

"اگر تمہارا یہ الزام جھوٹا نکلا تو جانتے ہو میں کیا کروں گا؟ " چودھری نے اُسے غضب ناک نگاہوں سے گھورا۔" میں تجھے زندہ اپنے شکاری کتے کے سامنے ڈال دوں گا جو تمہاری ہڈیاں تک چباڈالیں گے۔"

"ربّ دی سوں چودھری جی! یہی سچ ہے۔"

"سچ جھوٹ کا میں جلد پتا لگالوں گا۔ فی الحال تم ایک کام کرو۔"

"حکم کریں چودھری جی۔"

"اُس حرام زادے کا نام کیا ہے؟"

"ارشد زمان ہے جی۔"

"کوئی پتا ٹھکانہ؟"

"یہ تو جی صفیہ بی بی کو معلوم ہو گا۔" دلاور نے سر جھکا کر جواب دیا۔

چودھری تحکمانہ لہجے میں بولا۔" ٹھیک ہے تم جاؤ لیکن خبر دار یہ بات اگر تم نے کسی کو بتائی تو پھر مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔"

"توبہ کریں جی۔" دلاور نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔"میں انسان تو کیا کسی دیوار کے سامنے بھی یہ بات نہیں کہوں گا۔"

☆☆☆

اُس روز وہ دونوں ملے تو صفیہ قدرے اُداس تھی۔ ارشد نے جب استفسار کیا تو وہ بولی۔ ”چند روز سے مجھے فرمان بھائی کا رویہ کچھ بدلا بدلا سا لگتا ہے۔ یوں جیسے وہ مجھ پر شک کرنے لگے ہوں۔“

”یہ تمہارا وہم بھی تو ہو سکتا ہے؟ شاید وہ اپنی کسی پریشانی کے سبب تم پر توجہ نہیں دے پا رہا ہو۔“ اُس نے دلیل دی۔

”بات توجہ کی نہیں ہے۔ بھائی جان مجھ سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔“

”ڈونٹ بی سلی صفیہ! تم بلاوجہ پریشان ہو رہی ہو۔“

وہ بولی۔ ”نہیں میں بچی نہیں ہوں کہ بے اعتنائی اور پریشانی کے درمیان فرق محسوس نہ کر سکوں۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے؟“

”ممطلباُسے ہماری محبت کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔“ اُس نے اٹکتے ہوئے بات مکمل کی۔

”ارشی! تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو رہے ہو؟“ صفیہ نے متحیر انداز میں پوچھا۔

”تو اور کیا قہقہے لگاؤں؟“ وہ ایک دم بگڑ گیا۔



وہ بولی۔" عشق اور مشک بھی بھلا کبھی چھپتے ہیں۔ یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ اگر بھائی کو سچ مچ ہماری محبت کے بارے میں پتا چل گیا ہے تو یہ اچھا ہی ہوا ہے۔ اب میں آسانی کے ساتھ اُن سے بات کر سکوں گی۔"

"ممیرے خیال میں اب ہمیں احتیاط برتنا چاہیے۔" اُس نے خوف زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا۔

"تم اس قدر بزدل نکلو گے، یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ڈرنا ہی تھا تو پھر مجھ سے پیار کیوں کیا؟"

"احمقانہ سوال مت کرو۔" وہ تیوری پر بل ڈالتے ہوئے بولا۔"ڈرنے اور احتیاط برتنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں ڈر نہیں رہا احتیاط برت رہا ہوں۔"

"ہم نے کوئی جُرم نہیں کیا کہ احتیاط برتیں؟ پیار کیا ہے اور پیار کرنے والے تو جلتے ہوئے انگاروں پر بھی چلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ تو راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ٹھوکر مار کر گزر جاتے ہیں۔ پہاڑ، دریا اور صحرا تو اُن کے راستے کے سنگِ میل ہوتے ہیں۔"

وہ بولا۔" یہ سب فلمی ڈائیلاگ ہیں۔ حقیقت ان سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ تمہارے بھائی نہ تو پہاڑ ہیں اور نہ ہی صحرا او دریا۔ وہ جیتے جاگتے انسان ہیں اور یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ اُن کا



تعلق انسانوں کی جس قبیل سے ہے وہ احساسات و جذبات سے قطعی طور پر عاری ہوتی ہے۔وہ گولی پہلے چلاتے ہیں اور جُرم بعد میں پوچھتے ہیں۔"

ارشد زمان کا یہ روپ وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔اُسے اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسی بزدلی کی باتیں بھی کر سکتا ہے۔مگر یہ حقیقت تھی کوئی خواب نہیں تھا کہ وہ اُسے جھٹلا دیتی۔وہ چند لمحے تو حیرت اور دُکھ کی ملی جلی کیفیت میں اُس کی طرف دیکھتی رہی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔" چلو اچھا ہوا کہ جلد ہی تمہارا اصل روپ میرے سامنے آگیا ورنہ میں تو تجھے اب تک مرد ہی سمجھتی آرہی تھی۔"

وہ بولا۔" تیرے بھائی ہاتھی ہیں اور میں چیونٹی۔اُن سے بھڑوں گا تو مسل دیا جاؤں گا۔بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی راہیں الگ کر لیں۔"

"راہیں ہی الگ کرنا تھیں تو مجھے ان راہوں پر لائے کیوں؟"

"یہ بات تو تمہیں سوچنا تھی ناں کہ"

ایسے وقت چودھری فرمان کے بھیجے ہوئے چند غنڈے اُن کے سر پر پہنچ گئے اور ارشد زمان کی بات ادھوری رہ گئی۔

"اوئے کی ناں اے تیرا؟" غنڈوں کے سرغنے نے پولیس والوں کے انداز میں سوال کیا۔

اُن کے تیور اور خوف ناک شکلیں دیکھ کروہ ایک دم گھبرا گیا۔ گھگھیا کر بولا۔ "م��
��میں جیبیہاں کا کالج میں پڑھتا ہوں۔"

"اوئے! میں نے تیرا " ناں " پوچھا ہے۔ یہ نہیں پوچھا تُو کالج میں پڑھتا ہے یا یونی وَرّسٹی میں؟"

"ارار شد زمان ہے جی۔" اُس نے بمشکل جواب دیا۔

"یہ تُو ہر بات پر جی جی کیوں کہتا ہے۔ کیا مجھے سکول ماشٹر سمجھ رکھا ہے؟" سرغنے نے دانت نکالے تو اُس کے تینوں ساتھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گئے۔

صفیہ جو غصے میں تاؤ کھا رہی تھی۔ مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ "کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟"

"بی بی! آپ سے تو میں نے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ آپ یہاں سے نکل لیں، یہ اِس کا اور ہمارا معاملا ہے۔"

"تم جانتے ہو کس سے بات کر رہے ہو؟" اُس کے جاگیر دارانہ لہو نے جوش مارا۔ "میں چودھری فرمان حیدر کی چھوٹی بہن ہوں۔ اُسے پتا چلا تو تم لوگوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔"

وہ بولا۔" کوئی بات نہیں بی بی! ہم لوگ ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے نہیں ڈرتے۔ آپ جائیں اور اپنے بھائی سے بلا جھجک ہماری شکایت کر دیں۔ ہم اسے ساتھ لے جارہے ہیں۔ اِس سے کچھ حساب کتاب چکتا کرنا ہے۔ اس کے بعد اسے چھوڑ دیں گے۔"

"میرے ہوتے ہوئے تم لوگ اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔" وہ اپنے محبوب اور غنڈوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔

"تو ٹھیک ہے ہم اسے سیدھا اللہ میاں کے پاس بھیج دیتے ہیں۔" سرغنے نے پستول نکالتے ہوئے کہا۔" پھر اس کی لاش پر بیٹھ کر بین کرتی رہنا۔"

"صفیہ! پلیز تم جاؤ مم میں ان کے ساتھ جاتا ہوں۔" پستول دیکھ کر اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

"بالکل درست فیصلہ کیا ہے تم نے۔" سرغنے نے استہزائیہ انداز میں صفیہ کی طرف دیکھا۔" یہ بی بی تو تجھے بے موت مروانے پر تلی ہوئی ہے۔ اب چلو پارک کے مین گیٹ کے ساتھ ہی ہماری گاڑی کھڑی ہوئی ہے۔"

وہ بغیر کوئی حجت کیے اُن کے ساتھ چل دیا۔ جب کہ صفیہ محض دانت پیس کر رہ گئی۔

چاروں غنڈے اُسے لیے چودھری فرمان کے فارم پر پہنچ گئے۔ارشد زمان اس قدر خوف زدہ تھا کہ وہ اُن میں سے کسی سے یہ تک پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا کہ وہ اُسے کیوں اور کس جُرم میں یوں اُٹھا کر لے جا رہے ہیں؟

چودھری فرمان اپنے چھوٹے بھائی قربان کے ساتھ فارم میں موجود تھا۔ارشد زمان کو دیکھ کر وہ سرغنے کو شاباش دیتے ہوئے بولا۔" تم صرف نام کے دلاور نہیں ہو بلکہ کام کے بھی دلاور ہو۔ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو توقع سے بھی زیادہ انعام ملے گا۔"

"چودھری صاحب!یہ دلاورآپ کا خادم ہے اور ہمیشہ خادم ہی رہے گا۔" دلاور نے خوشامدی لہجے میں جواب دیا۔

چودھری نے کہا۔" تمہاری یہی ادا تو مجھے پسند ہے۔تم ناممکن کام کو بھی ممکن بنا دیتے ہو۔"

"آپ کی مہربانی اور بندہ پروری کا ممنوں ہوں جناب۔"

"اوکے۔" چودھری نے سرہلایا۔" تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر بیٹھ کر انتظار کرو۔تب تک میں اس مجنوں کی اولاد سے چند باتیں کر لیتا ہوں۔"

وہ چاروں سلام کرتے ہوئے باہر نکل گئے تو چودھری فرمان ارشد زمان کی طرف متوجہ ہو گیا۔"تجھے شیر کی کچھار میں گھسنے کی کیا پڑی تھی؟"

"ممیں کچھ سمجھا نہیں جناب! آپ کون ہیں اور مجھے یہاں کس لیے بلایا ہے؟"



''ہم تیری منحوس شکل دیکھنا چاہتے تھے۔'' چودھری قربان نے مداخلت کی۔''حرام کے پلے! تم نے کیا سوچ کر ہماری معصوم بہن کو ورغلایا کیا تجھے اپنی زندگی سے ذرا سا بھی پیار نہیں ہے؟''

''اس میں میمیرا کوئی دوش نہیں جناب! ممیں میں''

''بکواس بند کرو۔'' چودھری فرمان نے اُسے ٹوک دیا۔'' ہم کیا تجھے بے وقوف نظر آتے ہیں؟''

''ننںنہیں جناب! ممیں نے ایسا کب کہا ہے؟''اُس نے خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''ڈرو نہیں، ہم تجھے قتل نہیں کریں گے بس تیرے دونوں بازو توڑ کر تجھے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیں گے۔ تیری زندگی اب بھیک کے ٹکڑوں پر گزرے گی۔ یہ کم سے کم سزا ہے تیرے لیے۔'' چودھری قربان نے بے رحم انداز میں اُسے گھورا۔

''ممیں صف صفیہ کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں خدا کے لیے ممجھے معاف کر دو۔'' وہ فریاد کرتے ہوئے رونے لگا۔

''اوئے! تم مرد ہو؟'' چودھری فرمان نے طنزیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا۔''یا پھر تمہارا تعلق تیسری صنف ہے؟''

وہ خوف ودہشت کے مارے چودھری کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔بس روئے جارہاتھا۔شاید اس توقع پر کہ چودھری اُسے معاف کردیں گے مگرچودھری رحم کے لفظ سے ناآشناتھے۔معافی کا لفظ اُن کی ڈکشنری میں نہیں تھا۔دونوں بھائی اُس کے رونے سے اور بھی غضب ناک ہوگئے۔چنانچہ چودھری قربان نے نتھنے پھلاتے ہوئے دلاور کو آوازدی۔

دلاور چراغ کے جن کی طرح فوراًحاضر ہوگیا۔"حکم سائیں؟"

"لے جاؤ اس حرام زادے کواوراس کے دونوں بازوتوڑکراسے کوڑاکرکٹ کے ڈھیرپر پھینک دو۔" چودھری قربان نے بے رحمانہ انداز میں حکم دیا۔

"بے فکر رہیں سائیں ایسا ہی ہو گا۔" دلاورنے اثبات میں سر ہلایااور پھرارشدزمان کو پکڑکرکمرے سے باہرلے گیا۔

وہ بیس کنال کے رقبے پر پھیلاہواوسیع وعریض فارم تھا۔دلاوراور اُس کے ساتھی اُسے رہائشی حصے سے قدرے فاصلے پر لے گئے اور پھراُس پریوں جھپٹے جیسے بھوکا باز چڑیاپر جھپٹتاہے۔لاتیں اور گھونسے اُس پر بارش کی طرح برسنے لگے۔وہ چیختارہا،اُن سے رحم کی فریادکرتارہامگراُس کی فریاد و آہ وزاری اُن لوگوں کے قہقہوں میں دب کررہ گئی۔وہ نہایت ہی بے رحمی کے ساتھ اُسے مارتے رہے۔یہاں تک کہ اُس کے دونوں بازو کہنیوں

سے ٹوٹ کر محض کھال کے سہارے جھولنے لگے۔درد کے کئی دریاعبور کرنے کے بعد آخرکاروہ بے ہوش ہو گیا۔تب دلاوراور اُس کے ساتھیوں نے اُسے گھسیٹ کر گاڑی میں پٹخا اور فارم سے دُور کوڑے کے ایک ڈھیر پر پھینک دیا۔

☆☆☆

آنکھ کھلنے پر اُس نے خود کوایک نجی ہاسپٹل کے سفید بستر پر پایا۔اُس کے دونوں بازوؤں پر پلستر چڑھا ہوا تھا۔بیڈ کے قریب ہی کرسی پر ایک اجنبی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اجنبی کی عمر پینتالیس اور پچاس برس کے درمیان تھی۔اُسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اجنبی کے چہرے پر اطمینان کے آثار پھیل گئے اوروہ دھیرے سے مسکرا کر بولا۔" اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمھیں ہوش آگیا۔"

"آ۔آپ کون ہیں؟"اُس نے نحیف لہجے میں پوچھا۔

"بیٹا!میں ہی تجھے یہاں لایا ہوں۔تم کوڑے کے ایک ڈھیر پر پڑے ہوئے تھے۔تم اگر بُرا نہ مانو تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمھاری یہ حالت کس ظالم نے کی؟" اجنبی نے ہمدردانہ لہجے میں سوال کیا۔

"انکل!آپ نے مجھے مرنے دیا ہوتا ناں!کیوں اُٹھا کر لے آئے؟"اُس نے اُلٹا سوال کر دیا۔



"کیسی بات کرتے ہو بیٹا؟" اجنبی مسکرایا۔"میں ایک انسان کو بھلا مرنے کے لیے چھوڑ سکتا تھا۔ گو کہ میں تمہارے لیے اجنبی ہوں مگر انسانیت کا رشتا بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے؟ "

"وہ بھی تو انسان ہی تھے۔ جنھوں نے میرا یہ حال کیا؟"

"انسان انسانیت سے بنتا ہے محض شکل وشباہت سے نہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ دو ہاتھ اور دو پاؤں رکھنے والا ہر شخص انسان ہی ہو اُن میں بہت سارے لوگ آدمی کے روپ میں بھیڑیے بھی ہوتے ہیں۔"

"ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں وہ واقعی بھیڑیے ہی تھے۔"

"تو پھر مجھے بتاؤ کہ وہ کون تھے؟"

وہ چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔ یوں جیسے ٹوٹی کہانی کی کڑیاں جوڑ رہا ہو۔ اس کے بعد تمام واقعات اُس نے اجنبی کے سامنے بیان کر دیے۔

اجنبی بولا۔" مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگتا۔ غلطی تمہاری تھی، اُس لڑکی کی نہیں۔ دل کی مثال اُس معصوم بچے کی سی ہوتی ہے جو چاند کو دیکھ کر اُس کی طرف ہمکتا ہے لیکن چاند اُس کی رسائی سے بہت دُور ہوتا ہے۔ انسان کو دل کی ترغیبات پر نہیں بلکہ دماغ کی ترغیبات پر توجہ دینا چاہیے۔"

"ہاں واقعی یہ میری بھول تھی۔مجھے صفیہ کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔وہ ایک جاگیر دار باپ کی اولاد ہے جب کہ میں ایک گم نام اور لاوارث انسان ہوں۔ہمارا میل کسی صورت ممکن نہیں ہے۔"

وہ تقریباًپندرہ روز تک ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہا۔اس دوران میں وہ اجنبی جس کا نام جمیل احمد تھا برابراُس کا خیال رکھتا رہا۔ہاسپٹل کے سارے اخراجات جمیل احمد نے ادا کیے تھے۔جمیل احمد کی یہ مہربانیاں اُس کی سمجھ سے باہر تھیں مگر وہ جمیل احمد سے کچھ بھی پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔بیسویں روز وہ جمیل احمد کے ساتھ کراچی پہنچ چکا تھا۔جمیل احمد کا تعلق کراچی کی ایک مڈل کلاس فیملی سے تھا۔گھر میں کل دو ہی فرد تھے ایک جمیل احمد اور دوسری اُس کی نوجوان بیٹی عائشہ جو میٹرک تک پڑھی ہوئی تھی۔صحت یاب ہونے کے بعد اُس نے یونی ورسٹی میں داخلہ لیا اور ٹوٹا ہوا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شرع ہو گیا۔پڑھنے لکھنے میں وہ ویسے بھی بہت تیز تھا۔چنانچہ چار سال کے بعد وہ نفسیات میں ماسٹری ڈگری حاصل کر چکا تھا۔تب جمیل احمد نے اپنے سورس استعمال کرتے ہوئے اُسے اُسی یونی ورسٹی میں لیکچرار لگوادیا اور یوں وہ ارشد زمان سے پروفیسر ارشد زمان بن گیا۔

سروس ملنے کے بعد اُس کے حالات تیزی سے بہتر ہوتے گئے اور پھر اُس کی رضامندی سے جمیل احمد نے اپنی بیٹی کی شادی اُس کے ساتھ کر دی۔شادی کے ساتویں سال جب عاتکہ

پیدا ہوئی تو اُس وقت جمیل احمد انتقال کر چکا تھا۔عاتکہ کی پیدائش سے قبل بھی عائشہ بیگم نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا مگر وہ چند ماہ سے زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا۔

پروفیسر نے سسر کی وفات کے بعد اُس کا پرنٹنگ پریس اور ذاتی گھر جو وہ اپنی بیٹی کے نام کر گیا تھا۔دونوں کو ایک ساتھ بیچ دیا اور شہر کے پوش علاقے میں ایک بنگلہ نما مکان خرید لیا۔شادی کے دسویں سال پروفیسر کی بیوی عائشہ بیگم بھی ننھی عاتکہ کو چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔تب پروفیسر نے دوسری شادی کرنے کے بجائے اپنی ساری توجہ عاتکہ پر مرکوز کر دی۔اُس نے عاتکہ کی دیکھ بھال اور گھریلو کام کاج کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھ لی تھی، جس کا نام فاطمہ تھا۔

☆☆☆

"پاپا!ایک سوال پوچھوں؟"جونہی پروفیسر کی سرگزشت اختتام پذیر ہوئی عاتکہ نے سوال کیا۔

"ہاں پوچھو۔"پروفیسر نے کھوئے کھوئے سے انداز میں جواب دیا۔

وہ بولی۔" پاپا!آپ کی کہانی سن کر مجھے اس بات کی سمجھ تو آگئی کہ آپ چودھریوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں مگر اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ آپ محبت سے کیوں نفرت لگے ہیں؟اس میں محبت کا کیا دوش ہے؟"



"یہ بات تو میں خود بھی نہیں جانتا۔"اُس کے لبوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ اُبھر کر معدوم ہو گئی۔

"یہ کیسے ممکن ہے پاپا؟" وہ اُلجھ گئی۔

"بس جیسے بھی ممکن ہے تم اس قصے کو چھوڑو اور اپنا دھیان تعلیم پر دو۔" اُس نے بگڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں پاپا! ابھی میرے کچھ سوال تشنہ ہیں۔ مجھے اُن کے جوابات معلوم کرنے ہیں۔"

وہ بولا۔" میں نے سب کچھ تو بتا دیا ہے اور کیا چاہتی ہو؟"

"مثلاً اُس لڑکی صفیہ کا کیا بنا جسے چھوڑ کر آپ کراچی چلے آئے تھے؟"

"میں نے اُسے چھوڑا نہیں تھا۔" پروفیسر نے احتجاج کیا۔" اپنی جان بچانے کے لیے کراچی آ گیا تھا اور اب مجھے اُس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ مگر میرا قیاس کہتا ہے کہ اُسے اُس کے بھائیوں نے مار ڈالا ہو گا؟"

"آپ کا قیاس غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ زندہ ہو؟"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ زندہ ہو اور اُس نے کسی چودھری سے شادی کر لی ہو؟"

عاتکہ بولی۔" پاپا! اگر وہ زندہ ہے تو پھر مجھے یقین ہے کہ اُس نے اب تک شادی نہیں کی ہو گی۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" اُسے غصہ آگیا۔" یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہی ہو تمہیں کیا پتا کہ اُس نے شادی کی ہے یا نہیں؟"

"پاپا! میں آپ سے بحث نہیں کر سکتی لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اُس نے شادی نہیں کی ہو گی۔"

اتنا عرصہ بیت جانے کے بعد بھی پروفیسر صفیہ حیدر کو بھلا نہیں پایا تھا۔ تاہم اُس کے بھائیوں کے خوف سے اُس نے کبھی بھی صفیہ کے متعلق کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جب بھی اپنی کہنیوں کی طرف دیکھتا تھا تو اُس کے سامنے صفیہ کے بھائیوں کے غضب ناک چہرے آجاتے اور وہ ایک جھر جھری سی لے کر رہ جاتا تھا۔ مگر اب جب کہ اُس کی اپنی بیٹی صفیہ کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھی تو وہ بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"آپ کیا سوچنے لگ گئے ہیں پاپا؟" عاتکہ نے اُسے سوچوں میں گھرا دیکھ کر سوال کیا۔

"کککچھ نہیں بس ایسے ذرا کھو گیا تھا۔"

"پاپا! ایک بات کہوں آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟"

"کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟ میں بُرا نہیں مانوں گا۔"

"پاپا! مجھے لگتا ہے کہ آپ اب تک اُسے بھلا نہیں پائے۔اب بھی اُس کے بارے میں سوچتے ہیں اور تنہائیوں میں کڑھتے ہیں۔"

"نہیں یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔بھلا میں کیوں اُس کے بارے میں سوچوں گا؟" جواب دیتے ہوئے اُس نے چہرہ دوسری جانب کر لیا تھا تاکہ عاتکہ اُس کی بھیگی پلکیں نہ دیکھ سکے۔مگر یہ اُس کی غلط فہمی تھی۔عاتکہ بچی نہیں تھی۔اُسے معلوم تھا کہ وہ اُس سے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ بولی۔" پاپا! میں جانتی ہوں کہ آپ کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔لیکن کاش کہ میں ان کا مداوا کر سکتی؟"

"ارے تم پاگل ہو۔" وہ اُس کی جانب گھومتے ہوئے مسکرایا۔"مرد بھی بھلا کبھی آنسو بہاتے ہیں؟"

"سبھی بہاتے ہیں پاپا! مگر تنہائیوں میں چھپ چھپ کر ورنہ دنیا تماشا بنا لیتی ہے اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو غیر محسوس انداز میں روتے ہیں۔اُن کی آنکھیں تو خشک ہوتی ہیں لیکن دل روتا ہے۔مگر دل کا رونا کون دیکھتا ہے؟ اپنا درد تو انسان خود ہی محسوس کر سکتا ہے ناں! دوسروں کو اُس کا درد بھلا کیسے دکھائی دے گا؟ درد کی کوئی شکل تو ہوتی ہی نہیں۔سوا اپنے غیر سبھی انجان رہتے ہیں ۔وہ جسے زندہ سمجھتے ہیں دراصل وہ



مر چکا ہوتا ہے۔" عاتکہ نے انتہائی کرب کے عالم میں جواب دیا اور پھر اُس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"تمتم رو رہی ہو عاتکہ! للیکن کیوں؟" پروفیسر کے چہرے پر حیرت تھی۔

"بس ایسے ہی پاپا! آنکھ میں شاید کچھ پڑ گیا ہے۔" وہ اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ جب کہ پروفیسر کی حیرت دوچند ہو گئی۔

☆☆☆

"عدنان! تم آج کل یونی ورسٹی کیوں نہیں جا رہے؟" اُس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی پوچھا۔

"بس ایسے ہی امی! دل نہیں چاہتا۔" اُس نے مرجھائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"دلیکن کیوں؟" وہ مسکرائی۔ "کیا کسی کو دل دے بیٹھے ہو؟"

"نہیں امی! ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔" اُس نے چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ سجاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تم عاتکہ کو چاہتے ہو لیکن تسلیم نہیں کرتے۔ بتاؤ بات کیا ہے۔ کیا وہ تم سے ناراض ہو گئی ہے؟"

"میں نے کہاناں !امی ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ آپ توخواہ مخواہ ہی میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔" وہ جھنجھلا اُٹھا۔

"عدنان !بیٹے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے ورنہ اس سے قبل تو تم نے کبھی یونی ورسٹی سے ناغہ کیا ہے اور نہ مجھ سے اس لہجے میں بات کی ہے؟"

"سوری امی۔" وہ نادم انداز میں بولا۔"دراصل میں کچھ پریشان ہوں۔بات بھی ایسی ہے کہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

وہ مسکرائی۔" پاگل نہ ہو توماں سے بھی بھلا کوئی بات چھپاتا ہے۔بتاؤ تمہیں کیا پریشانی ہے؟ "

"امی !وہ ہوبعا تکہ کے ابو نے اُسے مجھ سے ملنے جلنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا ہے۔"

"لیکن کیوں کس لیے؟"

وہ بولا۔" اُس کا ابو ہماری ہی یونی ورسٹی میں پروفیسر ہے۔ایک دن محبت کے موضوع پر میں نے اُس سے بحث چھیڑ دی اور اس بحث میں میرا پلڑا بھاری رہا،بس اُسی دن سے وہ میرا دشمن بن گیا۔دراصل وہ لفظ محبت سے بہت زیادہ متنفر ہے۔مجھے آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ وہ محبت سے نفرت کیوں کرتا ہے۔حالانکہ دنیا کی ساری رونقیں محبت ہی کے دم سے ہیں۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ پروفیسر محبت میں ناکام ہونے کے بعد محبت سے چڑنے لگا ہو؟"

"میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ پروفیسر کے ماضی کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا۔ حتیٰ کہ اُس نے اپنی بیٹی کو بھی کچھ نہیں بتایا۔"

وہ بولی۔" چلو دفع کرو پروفیسر کو، تم عاتکہ سے موبائل فون کے ذریعے بات کیوں نہیں کرتے؟"

"امی! موبائل فون تو اُس کے پاس بھی ہے۔ وہ کیوں نہیں کرتی مجھ سے بات؟"

"عدنان! محبت میں انا کی قربانی دینا پڑتی ہے ورنہ انسان تہی دست رہ جاتا ہے۔ تم اگر واقعی عاتکہ کو چاہتے ہو تو پھر اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ مت بناؤ ورنہ عاتکہ کو کھو بیٹھو گے۔"

"نہیں امی۔" اُس نے انکار میں سر ہلایا۔" میں پہل نہیں کروں گا۔ اُسے اگر مجھ سے پیار ہے تو وہ خود ہی بات کرے گی۔"

"وہ لڑکی ہے۔ مجبور ہو گی۔ جب کہ تم مرد ہو پہل تجھے کرنا پڑے گی۔"

"سوری امی! یہ ناممکن ہے۔ میں ایسا کبھی بھی نہیں کروں گا۔"

وہ بولی۔" اس کا مطلب ہے کہ تم عاتکہ سے محبت نہیں کرتے ورنہ ایک معمولی سی بات کو تم یوں اپنی انا کا مسئلہ نہ بناتے؟"

"انا کا مسئلہ میں نے نہیں اُس نے بنا رکھا ہے۔"

"نہیں۔" اُس نے انکار میں سر ہلایا۔" میں یہ بات نہیں مان سکتی۔اس لیے کہ میں ایک عورت ہوں اور ایک عورت ہی دوسری عورت کا دُکھ سمجھ سکتی ہے۔ محبت میں ہمیشہ مرد ہی دھوکا دیتے ہیں۔ عورت بے چاری تو اپنا سب کچھ اپنے محبوب پہ وار دیتی ہے مگر پھر بھی تہی دست رہتی ہے۔"

"آپ میری ماں ہیں کہ عاتکہ کی؟"اُس نے غصے کے عالم میں سوال کیا۔

وہ بولی۔" دنیا کی ہر عورت پہلے عورت ہوتی ہے بعد میں ماں۔بے شک میں تمہاری ماں ہوں مگر ہوں تو عورت ہی ناں؟تم میں اگر عاتکہ سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہے تو میں خود اُس سے بات کرلوں گی۔لاؤ مجھے دو اپنا فون۔"

"امی!آپ کیا سمجھتی ہیں میں اُس سے بات کرنے سے ڈرتا ہوں؟"

"تمہاری باتوں سے تو یہی لگتا ہے کہ تم پروفیسر سے خوفزدہ ہو؟"

وہ بولا۔" یہ بھول ہے آپ کی۔میں بھلا پروفیسر سے کیوں ڈرنے لگا،وہ کیا بگاڑ لے گا میرا؟"

"اگر یہ بات ہے تو پھر جاؤ عاتکہ سے بات کرو۔ میں مان جاؤں گی کہ تم ایک باہمت مرد ہو۔"

"آپ مجھے چیلنج کر رہی ہیں؟"

"یہی سمجھ لو۔" وہ مسکرائی۔

"میں عاتکہ کو اُٹھا کر لے آؤں گا۔ پھر یہ مت کہنا کہ میں نے غلط قدم اُٹھایا ہے؟ پروفیسر ایک خبطی انسان ہے۔ ردعمل میں کچھ بھی کر سکتا ہے؟"

"اُٹھا کر نہیں بلکہ پروفیسر کو منا کر لانا۔ پیار میں زور زبردستی نہیں ثابت قدمی کام آتی ہے۔"

وہ بولا۔" پروفیسر کو منانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ وہ مر تو سکتا ہے مگر مجھے اور عاتکہ کو ایک نہیں ہونے دے گا۔ وہ کھلا دشمن ہے محبت کا۔"

"یہ بات تمہیں پیار کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھی۔ محبت میں دُکھ درد اور زمانے کی سختیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ محبت ایک راہِ خارزار ہے اس پر چلتے ہوئے پاؤں کے چھالوں کا حساب نہیں رکھا جاتا۔ اُسے جیتنا ہے تو پہلے پروفیسر کا دل جیتو۔"

"بہت مشکل ہے امی۔"

"مشکل ہے ناں! ناممکن تو نہیں ہے۔پیار کرنے والے تو ناممکن کو بھی ممکن بنادیتے ہیں۔ تم کیسے مرد ہو کہ محبت میں مشکلات کا رونا رو رہے ہو؟"

"امی! آپ کس زمانے کی بات کرتی ہیں۔ آج کل لیلیٰ مجنوں والی محبت نہیں رہی۔ بس لڑکی کو بھگا کر لے جاؤ اور کورٹ میرج کر لو۔ اللہ اللہ خیر صلا۔"

"وہ محبت نہیں ہوس کہلاتی ہے۔ تم ایسا کوئی بھی قدم نہیں اُٹھاؤ گے۔" وہ تحکمانہ لہجے میں بولی اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

وہ اتوار کا دن تھا۔ صبح کا ناشتا کرنے کے بعد پروفیسر اسٹڈی روم میں گھس کر مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ جب کہ فاطمہ بُوا کچن میں مصروف تھی۔ عاتکہ اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ کھولے نیٹ پر ٹائم پاس کر رہی تھی۔ ایسے ہی وقت اُس کا سیل فون گنگنانے لگا۔ اُس نے لیپ ٹاپ سے نظر ہٹاتے ہوئے سیل فون اُٹھالیا۔ اسکرین پر عدنان حیدر کا نام جھلملا رہا تھا۔ اُس کا دل بے اختیار دھڑک اُٹھا۔ عدنان سے اُس کا رابطہ بیس روز سے منقطع تھا اور اب وہ خود ہی پہل کر رہا تھا تو اُس نے کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو عاتکہ! کیسی ہو؟" اُس کی سماعتوں سے عدنان کی مانوس آواز ٹکرائی۔

"میں میں ٹھیک ہی ہوں بس۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی آواز بھرا گئی۔



"یہ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے۔ کہیں فلو وغیرہ تو نہیں ہو گیا ہے؟" عدنان نے مذاق کے انداز میں پوچھا۔

"پاپا سچ کہتے ہیں کہ یہ جاگیر دار لوگ کسی کے بھی نہیں ہوتے۔ یہ محض دوسروں کے دلوں سے کھیلنا جانتے ہیں۔" اُس کے لہجے میں شکایت تھی۔

"دلوں سے جاگیر دار کب کھیلتے ہیں؟ وہ تو تم جیسی کٹھور لڑکیاں کھیلتی ہیں۔"

"کٹھور میں نہیں تم ہو۔" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

وہ بولا۔ "میں کیسے کٹھور ہو گیا، میں نے تو کبھی تم سے پیار کا اظہار ہی نہیں کیا؟"

"تو اب کر لوناں! کسی نے روکا تو نہیں ہے؟"

"کیسے کروں تیرے پاپا سے ڈر لگتا ہے۔ وہ تو مجھے اس جُرم میں شوٹ کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ ویسے بھی وہ چودھریوں سے بے انتہا نفرت کرتے ہیں۔"

"اُن کی نفرت بے جا تو نہیں ہے۔ تمہارے باپ اور چچا نے پاپا پر بہت ظلم ڈھائے ہیں۔ مجھے پاپا نے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

وہ حیرت سے چلایا۔ "یہ یہ تم کیا کہہ رہی؟ میں نہیں مان سکتا۔ ایسا نا ممکن ہے۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔"



"میں بھلا جھوٹ کیوں بولوں گی؟ یہ سچ ہے تم مانو یا نہ مانو تمہاری مرضی مگر حقیقت جھٹلانے سے بدل نہیں سکتی۔"

"مجھے لگتا ہے تمہارے پاپا نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت تمہیں مجھ سے دُور رکھنے کے لیے یہ جھوٹ گھڑا ہے۔"

"وہ بھلا ایسا کیوں کریں گے۔ اس سے اُنھیں کیا فائدہ ہو گا؟"

"اس سوال کا جواب تو تمہارے پاپا کے پاس ہو گا۔ ویسے تمہارے پاپا نے تمہیں کہانی کیا سنائی ہے؟"

"اُنھوں نے مجھے کہانی نہیں اپنی آپ بیتی سنائی ہے اور یہ آپ بیتی فون پر بتانے والی نہیں ہے۔"

"چلو آپ بیتی سہی مگر تم مجھے بتاؤ گی کیسے، ہمارے ملنے پر تو پابندی ہے؟"

وہ بولی۔ "میں کوئی راستا نکالنے کی کوشش کرتی ہوں۔ پاپا سے بہانہ بناتی ہوں کہ مجھے کسی سہیلی سے ملنا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ مجھے اجازت دے دیں گے۔"

"لیکن کب؟ میں تمہارے پاپا کی داستان سننے کے لیے بہت بے چین ہوں۔ مجھ سے صبر نہیں ہو گا۔"

"فکر مت کرو بہت جلد میں تم سے ملنے آؤں گی۔ پاپا کی"



"پاپا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر۔" بالکل غیر متوقع طور پر کمرے میں داخل ہو کر پروفیسر نے اُس کی ادھوری بات مکمل کرتے ہوئے اُسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورا۔

"پاپا! ممیں وہدر اصلبات"

"خاموش۔" پروفیسر پوری قوت سے چلایا اور وہ سہم کر رہ گئی۔ "تمہیں شرم نہیں آتی باپ کو دھوکا دیتے ہوئے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ میں بالکل ہی بدھو ہوں؟ مجھے کسی بات کا بھی علم نہیں ہے۔میں جانتاہوں کہ عدنان حیدر کون ہے؟ وہ چودھری فرمان کا بیٹا ہے۔اگرچہ تم نے کبھی بھی مجھے اُس کے متعلق نہیں بتایا لیکن میں اُسے آج کا نہیں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔اُس دن سے جب اُس نے یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا۔کیا تم نہیں جانتیں کہ یونی ورسٹی میں ہر اسٹوڈنٹ کے مکمل کوائف درج ہوتے ہیں؟"

وہ بولی۔" پاپا! آپ باپ کے گناہوں کی سزا بیٹے کو کیوں دینا چاہتے ہیں آپ اگر پیار میں ناکام ہوئے ہیں تو اس میں عدنان کا کیا قصور ہے؟"

"بکواس مت کرو۔" پروفیسر چلایا اور اس کے ساتھ ہی کمرا "تڑاخ تڑاخ" کی آواز سے گونج اُٹھا۔" تم نے اگر دوبارہ اُس کا نام لیا تو میں تجھے کاٹ کر پھینک دوں گا۔ وہ میرے دشمن کا بیٹا ہے اور میں اُسے اُسی طرح تڑپاؤں گا جس طرح اُس کے باپ نے مجھے تڑپایا تھا۔"

عاتکہ نے کال ڈس کنکٹ نہیں کی تھی۔عدنان اُن کی باتیں سن رہا تھا۔چنانچہ وہ بلند آواز سے چلایا۔"عاتکہ !میں میں آرہاہوں میں آرہاہوں۔"

پروفیسر نے عاتکہ کے ہاتھ سے فون جھپٹااور سرد انداز میں بولا۔" شوق سے آجاؤ، آج تمہاری لاش ہی یہاں سے جائے گی۔"

وہ بولا۔" میں نے پیار کیاہے سر مر بھی گیاتو شہیدِ محبت کہلاؤں گا۔البتہ آپ ایک قاتل کے نام سے پہچانیں جائیں گے۔"

"میرا بس چلے تو ہر چودھری کانام ونشان مٹادوں۔"

"جیسے ایک ہاتھ کی ساری اُنگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔اسی طرح سارے چودھری بھی بُرے نہیں ہوتے۔"

"تم بے وقوف ہواور بے وقوف ہی رہوگے۔اگر زندگی پیاری ہے تو میرے گھر میں قدم مت رکھنا۔" پروفیسر نے دھمکی دی۔

وہ بولا۔" مجھے زندگی سے عاتکہ زیادہ پیاری ہے۔میں آرہاہوں اپناموقف ثابت کرنے۔آپ نے ایک دن مجھ سے پوچھا تھاناں!کہ کیامیں محبت میں جان دے سکتاہوں؟ توسنوپروفیسر صاحب!میں محبت میں جان دے سکتاہوں۔اس لیے کہ محبت جان دیتی ہے اور نفرت جان لیتی ہے۔آج یہ سچ ثابت ہو جائے گا۔"

"محبت کی ایسی کی تیسی۔" پروفیسر نے غصے کے عالم میں سیل فون پختہ دیوار پر دے مارا جو ایک چھناکے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فرش پر بکھر گیا۔

"دیکھ لیا تم نے۔" پروفیسر بیٹی کو غضب ناک نگاہوں سے گھورتے ہوئے چلایا۔"اس لڑکے نے مجھے دو کوڑی کا بنا کر رکھ دیا ہے اور یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔میں نے منع کیا تھا تمہیں کہ اس سے کوئی تعلق مت رکھنا۔ پھر تم نے کیوں کیا ایسا؟"

"پاپا! آپ مجھے گولی کیوں نہیں مار دیتے؟" وہ روتے ہوئے بولی۔"میں نہیں رہوں گی تو آپ ہر جھنجھٹ سے آزاد ہو جائیں گے۔"

"تمہیں نہیں میں اُسے گولی ماروں گا جو یہاں مرنے کے لیے آرہا ہے۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا اور پھر بیٹی کو روتا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ کمرے کی کھڑکی سے عدنان کو عاتکہ کے ساتھ سیل فون پر باتیں کرتے ہوئے نہ صرف دیکھ رہی تھی بلکہ عدنان کی باتیں اُسے سنائی بھی دے رہی تھیں۔یک طرفہ گفت گو سن کر وہ پوری صورت حال تو نہ جان سکی البتہ اُس پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ عدنان محبت کی خاطر اپنی جان دینے کا تہیہ کر چکا ہے۔وہ بغیر وقت ضائع کیے کمرے میں داخل ہوئی



اور عدنان سے بولی۔ "بیٹے! میں تمہاری ہمت کی داد دیتی ہوں مگر پروفیسر کے گھر تم اکیلے نہیں جاؤ گے میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"نہیں امی۔" اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ "یہ میری لڑائی ہے اور اسے میں اکیلا ہی لڑوں گا۔ آپ بس دعا کیجیے گا ان شاءاللہ مجھے کچھ بھی نہیں ہو گا۔"

وہ بولی۔ " میں محبت کے اُس دشمن کو دیکھنا چاہتی ہوں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کر بھی سگی بیٹی کے ارمانوں کا خون کرنا چاہتا ہے۔"

"پروفیسر آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر مجھے بزدلی کا طعنہ دے گا جو مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔"

"تو ٹھیک ہے۔میں تجھے اکیلے جانے کی اجازت نہیں دوں گی۔" اُس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

"آج آپ تو کیا مجھے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل کر گیراج کی طرف بڑھ گیا۔

"رکو عدنان۔" وہ عقب سے چلائی۔" یہ حماقت ہے۔میں تمہارے باپ کو کیا جواب دوں گی؟"



عدنان نے سنی ان سنی کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اور کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ چوکیدار نے اُسے دیکھتے ہی فوراً گیٹ کھول دیا۔ کھلی شاہراہ پر پہنچتے ہی اُس نے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ اُسے رہ رہ کر عاتکہ کا خیال آرہا تھا۔ بیس دنوں کی جدائی نے اُسے بتادیا تھا کہ وہ عاتکہ کو چاہتا ہے۔ حالانکہ جدائی سے قبل اس چاہت کا اُسے کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ عاتکہ کے اظہارِ محبت کو ہنسی میں اُڑادیا کرتا تھا۔ بارہا اُس نے عاتکہ کا دل توڑا تھا۔ بیتے دنوں کی یادیں مناظر کا روپ دھار کر اُس کے ذہن کے پردے پر کسی فلم کے مانند چلنے لگی تھیں۔ یہ یادیں خوش گوار بھی تھیں اور ناگوار بھی۔ پل میں اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور دوسرے پل میں یہی مسکراہٹ کرب کا روپ دھار لیتی۔ ایسے ہی وقت اسٹیرنگ وہیل پر اُس کی گرفت مضبوط ہو جاتی اور گاڑی فراٹے بھرنے لگتی۔ کئی جگہ تو اُس کی گاڑی ٹکراتے ٹکراتے بچ گئی مگر خوف کا ایک ہلکا سا شائبہ بھی اُس کے چہرے پر نمودار نہ ہوا۔ اُس وقت اُس کے ذہن پر صرف عاتکہ سوار تھی۔

لگ بھگ نصف گھنٹے کی خطرناک ڈرائیونگ کے بعد وہ پروفیسر کے بنگلے کے مین گیٹ پر پہنچ گیا۔ گیٹ پر تعینات چوکیدار نے اُسے رکنے کا اشارہ کیا مگر اُس پر تو جنون سوار تھا۔ چوکیدار کے اشارے کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس نے طاقت ور جیپ آگے بڑھادی۔ چوکیدار بھاگ کر ایک طرف ہو گیا جب کہ جیپ گیٹ کو توڑتے ہوئے بنگلے کے



اندر داخل ہوگئی۔کاریڈور کے سامنے جیپ روک کر وہ تیزی سے نیچے اُترا اور پھر چلا کر بولا۔"کہاں ہو عاتکہ! میں آگیا ہوں۔"

عاتکہ کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ تیزی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔سامنے ہی صوفے پر پروفیسر بیٹھا ہوا تھا اور اُس نے ہاتھ میں ایک ریوالور پکڑ رکھا تھا۔وہ ٹھٹک کر رک گیا۔پروفیسر کے سپاٹ چہرے پر بے رحمی کے تاثرات تھے۔

"مجھے یقین تھا کہ تم مرنے کے لیے یہاں ضرور آؤ گے۔"پروفیسر نے ریوالور سیدھا کرتے ہوئے کہا۔"اس لیے تمہاری موت کا سامان میرے ہاتھ میں موجود ہے۔"

وہ بولا۔" میں اگر موت سے ڈرتا تو یہاں آتا ہی کیوں؟"

پروفیسر نے کہا۔" میں تجھے ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔تم اگر اُلٹے قدموں واپس لوٹ جاؤ تو تمہاری جان بچ جائے گی۔"

"میں نے آپ سے موقع کب مانگا ہے؟"وہ لبوں پر طنزیہ ہنسی سجاتے ہوئے بولا۔" آپ گولی چلائیں میرا سینہ حاضر ہے۔دیکھتے ہیں آج کہ جیت کس کا مقدر بنتی ہے۔محبت یا پھر نفرت کا؟"

"نام مت لو محبت کا۔" پروفیسر چلایا۔"اس دور کا سب سے بڑا دھوکا ہے محبتیہاں کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا، سب اپنی اپنی خواہشات کے غلام ہیں، ڈھونگی ہیں۔بے وقوف بناتے ہیں محبت کے نام پر ایک دوسرے کو۔"

"سر! اگر آپ کے ساتھ محبت میں دھوکا ہوا ہے تو اس میں میرا اور عاتکہ کا کیا دوش ہے۔ہم نے کیا بگاڑا ہے آپ کا؟"

"تمہارا تمہارا قصور یہ ہے کہ تم چودھری فرمان کے بیٹے ہو۔" پروفیسر نے بالکل غیر متوقع طور پر یوں قہقہہ لگایا جیسے اُس کا دماغ اُلٹ گیا ہو۔" اور اور میں چودھری فرمان کے بیٹے کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ کبھی معاف نہیں کر سکتا۔آنکھیں بند کر لو میں گولی چلانے لگا ہوں۔"

"آپ گولی چلائیں سر! میں موت سے نہیں ڈرتا۔"عدنان نے نڈر لہجے میں جواب دیا۔

"اوکے جیسے تمہاری مرضی۔" اُس نے پھر قہقہہ لگایا۔"میں تین تک گنوں گا اور اس کے بعد گولی چلا دوں گا ایک دو"

ایسے ہی وقت وہ آندھی کی طرح اندر داخل ہوئی اور پروفیسر کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔

"ایک ماں کے ہوتے ہوئے کوئی اس کے بیٹے کا بال بھی بانکا نہیں کر سکتا۔ہمت ہے تو چلاؤ گولی۔" اُس کے لہجے سے عزم جھلک رہا تھا۔

"صفصفصفیہتتتتم۔" پروفیسر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔" یہیہیتمہارا بیٹا ہے؟ "

"ہاں یہ میرا ہی بیٹا ہے۔اسی لیے تو پشت کے بجائے سینے پہ گولی کھانا چاہتا ہے۔ تمہاری طرح بزدل ہوتا تو کب کا بھاگ چکا ہوتا۔اس نے تمہاری بیٹی سے محبت کی ہے اور محبت جان دینا سکھاتی ہے۔پشت پھیر کر بھاگنا نہیں۔ سمجھے تم پروفیسر ارشد زمان صاحب۔" صفیہ نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

"نہیں نہیں صفیہ !میں بزدل نہیں ہوں۔" وہ ہذیانی انداز میں چلایا۔" میں میں موت سے نہیں ڈرتا۔خدا گواہ ہے کہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔بالکل غلط سمجھ رہی ہو۔"

وہ بولی۔" چلاؤ مت، چلانے سے حقیقت بدل نہیں جاتی۔تم بزدل تھے۔بزدل ہو اور بزدل ہی رہو گے۔ریت کی دیواریں محبت کے بپھرے ہوئے دریاؤں کو نہیں روک سکتیں۔ کبھی نہیں روک سکتیں۔"

"اوکے تو پھر یہ دیکھ۔" اچانک ہی پروفیسر نے ریوالور سیدھا کر لیا۔

صفیہ کا دل دہل کر رہ گیا اور قوتِ گویائی پل بھر کے لیے سلب ہو گئی۔ موت اُس سے محض چند فٹ کی دُوری پر تھی۔ اُس نے شدت خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ ایسے ہی وقت پروفیسر نے ریوالور گھما کر اپنی کنپٹی پر رکھا اور فیصلہ کن لہجے میں بولا۔" صفیہ! آنکھیں کھول کر دیکھ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ بالکل نہیں ڈرتا۔ یقین نہیں آتا تو یہ دیکھ۔"

معاً ایک دھماکا ہوا اور پروفیسر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمیں بوس ہو گیا۔ اُس کی کنپٹی سے بہتا ہوا سُرخ لہو قالین میں میں جذب ہونے لگا۔ صفیہ بھاگ کر پروفیسر کے قریب پہنچی اور روتے ہوئے بولی۔" ارشی! یہ یہ تم نے کیا کر دیا ارے ظالم! مجھ سے پوچھا تو ہوتا کہ تمہارے گم ہو جانے کے بعد مجھ پر کیا بیتی؟ عدنان میرا نہیں بلکہ میرے بھائی فرمان کا بیٹا ہے۔ اُس کی ماں اُس کے بچپن میں گزر گئی تو میں نے اُسے اپنا آخری سہارا سمجھتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔ میں نے میں نے شادی نہ کرنے کی قسم کھالی تھی اور آج تک اُس قسم پہ قائم ہوں۔"

وہ نجانے کیا کیا کہتی رہی مگر پروفیسر کب کا ابدی نیند سو چکا تھا۔

ختم شد

